جھروکے

افسر صبوحی

کتب خانہ علم و ادب دہلی

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

طبع اوّل　　سنہ ۱۹۴۴ء　　قیمت ۲/

فہرست

۱	ترلوکی پنڈت	۵
۲	مرزا گوہر	۱۴
۳	رضائی	۲۳
۴	زندگی کی اندھیری راتیں	۳۴
۵	آغازِ شادی کا خواب	۵۴
۶	اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے	۶۱
۷	مرسارانی	۸۴
۸	دعوت	۹۹
۹	شوہر پرست بیوی	۱۱۸
۱۰	پریم کی اندھی	۱۳۴
۱۱	شدھا نتی	۱۴۸
۱۲	حافظ سلیم	۱۵۵
۱۳	خواجہ شریف	۱۶۷
۱۴	بابو منگینا	۲۰۱

ترلوکی پنڈت

ترلوکی پنڈت انقلابات کا مجسم نمونہ تھے۔ بچپن میں راجہ بختاور والی حویلی میں گزرے جوانی عیش میں گزری۔ شیش محل کی پریوں کے ساتھ ناچے۔ دولت لٹائی۔ نشہ اترا تو کانگریس کے کارکن قوم کے لیڈر رہے جیل کی ہوا کھائی۔ پھر جو رنگ بدلا تو گاندھی جی کی جیب سے نکل کر مہا سبھا کی گود میں اور وہاں سے جو چھٹے تو حکومت کے قدموں میں آ پڑے۔ آخر سرکار پرستوں میں نام لکھوا لیا۔ پڑھے لکھے تو کچھ یوں ہی سے تھے مگر زبان خوب چلتی تھی۔ کچھ دن رنگ اچھا جما تو تھوڑے بہت پیسے بھی کما لئے پھر خود بخود اس زندگی سے نفرت سی ہو گئی اور خانہ نشین ہو گئے۔ خانہ نشین ہونے سے میرا یہ مطلب ہے کہ دنیا سے بے تعلق ہو کر بیٹھ رہے ورنہ غریب کا کوئی گھر رہا تھا نہ گھر والے کرزن میل کے سامنے چھت والی گلی میں ایک زمین دوز دکان کرایہ پر لے رکھی تھی اسی میں رات دن پڑے رہتے تھے۔

بارہ برس کی عمر سے شراب کا چسکا تھا۔ مدتوں اکشا ملا پی۔ سودیشی کا چرچا ہوا تو ٹھرے پر اتر آئے پھر جب ذرا ہاتھ تنگ ہوا تو افیون کھانے لگے۔ ہم نے جب دیکھا افیم گھولتے اور حقہ کا دھواں اڑاتے دیکھا۔ کبھی کبھی کوئی جوگی فقیر آ جاتا تو چرس کی چلم بھی چلنے لگتی تھی۔ ورنہ عموماً اکیلے ہی بیٹھے پینک میں جھونٹے کھایا کرتے تھے۔ قریب ہی

بھٹیاروں کے گھر تھے۔ ان کی بلیاں آ کر اکثر ستایا کرتی تھیں۔ کبھی روٹی نکال لے جاتیں کبھی دودھ پی جاتیں۔ تو کی پنڈت بھیتری ودت دبک کرتے مگر وہ کب مانتی تھیں بے چارے کا روز دو چار پیسے کا نقصان کر جاتیں اول تو افیمی کا غصہ ہی کیا۔ ادہر مزاج میں تیزی ہوئی ادہر سر جھکنا اور آنکھیں بند ہونی شروع ہو گئیں دوسرے گوشت کے پیچھے کھانے والے بلاؤ۔ انتہا درجے کے خرانٹ، ذرا چھیڑا اور منڈیرے پر آئے۔ پھر پڑوسیوں سے لڑائی کون مول لے۔ کیسا ہی نقصان ہوتا دو چار کوسنے دس پانچ گالیاں دے کر بیٹھ رہتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ پنڈت جی صبح سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ شاید شاہ جی کی طرف نکل گئے ہوں گے یا کہیں اور نشہ پانی کی دعوت ہو گی۔ سورج ڈوبتے واپس آئے۔ رومو کا ایک بھٹیار وہاں میں لپٹا ہوا تھا۔ اسے کھولا، بنایا، آگ سلگائی منڈیا چڑھایا آٹا گوندھا۔ بھٹی تیار ہو گئی تو توا چڑھا کر روٹیاں پکائیں اور ایک کنستر میں رکھ کر پاس کنوئیں پہ نہائے۔ افیون گھولی۔ چسکی لگائی۔ حقہ بھرا اور آسن لگا گدی پہ بیٹھ گئے۔ اب پنڈت جی راجہ تھے، دنیا ان کے سامنے بھان متی کا تماشا تھی۔ آنکھیں کبھی بند ہو جاتی تھیں کبھی اونگھ کا جھٹکا کھا کر کھل جاتی تھیں۔ دماغ میں عرش معلیٰ سے بھی ادہر کی خبریں آ رہی تھیں۔ پہلو کے طاق پر مٹی کا ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹا کر بیسیوں قسم کی پرچھائیاں دکھا رہا تھا۔ کہیں مشین گن لگی ہوئی تھی کسی طرف لاٹھی چارج ہو رہا تھا اور کسی جگہ ادر وطن پہ خون کی بھینٹ چڑھانے والوں کی جوتیوں کے ڈھیر تھے کہ کوٹھری میں کوئی چیز دھڑ سے گری۔ پنڈت جی چونک پڑے کہ توپ کا گولہ پڑا۔ پھر آواز آئی "میاؤں"۔

آنکھیں جو کھولتے ہیں تو ان کا پرانا دشمن کالا بلا دودھ پہ پلا ہوا ہے۔ دھن جو بندی تو سمجھے کہ ہو نہ ہو یہ کوئی گاندھی جی کا مسلمان چیلا ہے۔ میری افیون کی تھیلی چھیننے آیا ہے۔ سنبھل کر ذرا گرا رہے پن سے بولے کہ "جناب مولانا اس روپ میں

آنے سے کیا فائدہ؟ وقت پر آدمی بن کے آؤ گے تو ایک پیالی تمہارے حصہ کی بھی پیش کروں گا ——" جواب میں پھر "میاؤں" سنا۔ گردن اٹھائی دیکھا تو واقعی پڑوس کا بلا تھا۔ خیال آیا کہ میں تو چاندنی چوک میں ایک دکان کے تختے کے نیچے پڑا ہوا ہنتوں کا ہتھیاروں سے مقابلہ دیکھتا رہا اور یہ غنڈا میرا دودھ پی گیا۔ ہے شرط کہ میں بھی اس کا خون پیوں۔ اتنے میں اندر سے غر فش کی آہستہ آہستہ مختلف آوازیں آنے لگیں۔ پنڈت جی اپنی پینگ میں سمجھے کہ بلا کہہ رہا ہے کہ "ہاں! تمہارا دودھ تو میں سب پی گیا اب کہو کیا کہتے ہو۔ ذرا بولے اور میں نے گلا دبا دیا۔ میرے کئی حمایتی بھی میرے ساتھ ہیں۔"

ترلوکی پنڈت نازک مزاج، نشے باز اور دھرم کے پکے ضرور تھے مگر تھے سمجھ دار۔ طبیعت انصاف پسند تھی، اس لیے نہ کانگریس والوں سے بنی نہ گورنمنٹ کے طفیلیوں میں رہ سکے۔ دیر تک سوچتے رہے کہ کیا جواب دیں۔ دودھ نہ ان کا تھا نہ ان کے باپ کا۔ دودھ تھا خدا کی پیدا کی ہوئی اور ہندوستان کے چارے سے پلی ہوئی گائے کا۔ اس پر جس قدر حق پنڈت جی کا تھا اسی قدر اس بلے کا بھی۔ دل میں قائل تھے۔ مگر انسان ہمیشہ سے اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے۔ دوسری مخلوق کے مقابلے میں تو خیر، اپنے ہم جنسوں سے بھی رات دن اس کے یہی فساد رہتے ہیں۔ پھر قدیم سے یہ بھی رسم چلی آتی ہے کہ کتا روٹی لے جائے گائے منہ ڈال دے بندر ہمسری کا دعویٰ کرے۔ بلی دودھ پی لے تو گالیاں ڈنڈا۔ لٹھ کسی نہ کسی چیز سے ضرور مقابلہ کرنا چاہیے۔ حقوق کا سوال۔ خاموش رہیں تو اشرف المخلوقات کون کہے۔ انسانی برادری میں نکو بن جائیں اور سب سے بڑھ کر یہ خوف تھا کہ کہیں یہ ارذل ترین مخلوق اپنی قوم ایک آریہ ورتی سورما کی بزدلی کا چرچا نہ کرے۔ اس لیے تاؤ آ ہی گیا اور ہاتھ سے ناریل رکھ کر دست پناہ، اٹھا بلی کی طرف لپکے۔

بلی کی ذات اس میں بھی بلا۔ ایک کا شو پنڈت چنیا بیگم کے مرید کی اینٹھ اکڑ خوب جانتا

تھا وہ ایسی گیدڑ بھبکیوں میں کیا آتا۔ اس نے بڑے اطمینان سے پنڈت جی کی طرف دیکھا انگڑائی لی اور میاؤں کہتا ہوا ایک کونے سے ہٹ کر دوسرے کونے میں جا بیٹھا۔ روگی پنڈت کا نشہ جا ہوا تھا۔ بلی ہاتھی نظر آ رہا تھا اور بلے کی آواز میں سوراج زندہ باد کا نعرہ سن رہے تھے۔ غصہ کو تھوک دیا دست پناہ پھینک، ناریل اٹھا اپنے آسن پر جا بیٹھے۔ اب انھیں بلے کی خرخریں مہاتما بدھ کے لیکچروں کا مزہ آنے لگا۔ گویا بلا کہہ رہا تھا کہ پنڈت جی مہاراج! ملک کے سیوک بننے کا دعویٰ اور ایسا غصہ، اپنے مزے میں ذرا سی کھنڈت برداشت نہ ہوئی آپے سے باہر ہو کر مارپیٹ پر آمادہ ہو گئے۔ آج دست پناہ اٹھایا ہے کل چھرا نکال لو گے۔ حقہ پیو تمباکو جل گیا ہے تو اور بھر لو اور ذرا شانتی سے بیٹھ کر غور کرو کیا پرماتما کو پیار صرف تمہارے ہی ساتھ ہے اس کے ناٹک میں اکیلے تم ہی ایکٹر ہو۔ دنیا کی ساری نعمتیں تمہارے لیے ہیں ہمارا ان پر کوئی حق نہیں۔ اس کے لئے کہ تم انسان ہو۔ صورت شکل، عادات و خصائل میں ضرور فرق ہے لیکن خدا کے کارخانہ میں ہمارا تمہارا ایک درجہ ہے ایک مسالہ۔ ایک کاریگر۔ اب یہ ہماری مسکینی اور تمہاری سرشوری تھی کہ تم اپنی زبان زوری سے آقا بن گئے اور ہم میاؤں میاؤں کرتے رہے پھر بھی ایسی بے انصافی کو تو روا نہ رکھو کہ آپ کھاؤ اور ہمیں نہ دو۔ مانگیں تو سونٹا لے کر دوڑو۔ جان تمہاری بھی ہماری بھی بھوک پیاس تمہیں ہی لگتی ہے ہمیں نہیں لگتی ہزاروں چیزیں تم ایسی کھاتے پیتے ہو جن کی طرف ہم آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے دودھ، دہی، مکھن، ملائی، گوشت وغیرہ تھوڑی سی ایسی چیزیں بھی ہیں جن کے کھانے کو ہمارا بھی جی چاہتا ہے تو آپ ہمارے کھانے پینے سے کیوں جلتے ہیں اور کس قانون سے ہم پر یہ تشدد روا رکھتے ہیں۔

یہ انسان کی پیدائشی ہٹ دھرمی ہے کہ وہ اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتا۔ اپنی برتری کے افسانے گھڑے ہیں۔ اپنا من مانا قانون بنا لیا ہے۔ سچ کہنا اگر یہی دودھ کوئی تمہاری پنڈت، کوئی انگریزی مولانا یا کوئی سماجی لیڈر پی جاتا تو کیا اس پر بھی یوں ہی

دست پناہ سے کر دوڑتے؟ ان کی اس بے تکلفی کا تم اتنا احسان مانتے۔ وہ تمہارے نزدیک
معزز ہیں۔ لیکن ان کو کیا ہم سے زیادہ بھوک لگتی ہے؟ مہاراج تم کیا کرو تمہاری سوسائٹی
کا دستور ہی یہ ہو گیا ہے کہ پیٹ بھروں کو کھلاتے ہو۔ اپنے سے زیادہ طاقت کو ڈنڈوت
کرتے ہو اور جو بھوک سے پریشان ہو کر بے بلائے آجاتے ہیں انھیں چور کہتے ہو اور بس
چلتا ہے تو لاٹھی پونگے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

یہ سچ ہے کہ چوری کرنا گناہ ہے۔ چور کی عزت نہیں۔ مگر اوں تو دودھ پی جانا
چوری نہیں۔ قدرتی پیداوار میں ہم تم سب برابر کے حصہ دار ہیں۔ دوسرے ہم بلے اگر
تمہارے چور ہیں تو تم ہماری بہن گائے کے چور ہو۔ پھر چوری کون کرتا ہے وہی جس کو
کھانے کو نہیں ملتا۔ جو اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے سے روکا جاتا ہے۔ دنیا میں جتنے بڑے
پیٹ والے انسانیت کے ٹھیکیدار سمجھے جاتے ہیں یہ مایا کا جال انہی کا بچھایا ہوا ہے یہی
دراصل چور گرہ ہیں۔ یہ اگر اپنا رویہ بدل ڈالیں اور غریبوں کے ساتھ سلوک کرنے لگیں تو
کوئی چور رہے نہ ڈاکو۔

ہمیں دیکھو اس گھر سے اس گھر اندھیرے اجالے میاؤں میاؤں کرتے پھرتے ہیں کبھی کسی
کی پتیلی میں منہ ڈال دینا یا کسی کے کبوتر کو لے بھاگنا یا جیسے تمہارا دودھ چٹ کر لیا۔ اس
طرح کسی کی کھیر کسی کے لڈو کھا جانا تو اور بات ہے ورنہ آپ ہی بتائیے کہ کوئی خدا کا بندہ
اپنی خوشی سے روٹی کا ٹکڑا بھی ہمارے آگے ڈالتا ہے۔ کتوں کو کبھی چپڑ کر روٹیاں دیتے
ہیں۔ سانپوں کو دودھ پلاتے ہیں چوہوں کو کھیلیں کھلاتے ہیں۔ چیونٹیوں کے بلوں کو
میدے اور شکر سے بھرتے ہیں مگر نہیں دیتے تو ہماری قوم کو۔ اس لئے کہ ہم بے ضرر ہیں
اور ہمیشہ میاؤں میاؤں کر کے منہ تکا کرتے ہیں۔ آواگون کے چکر میں بھی شاید ہمارا شمار نہیں
ہے کیا تمہارا کوئی مہاتما بھی بلی کی جون نہیں لیتا۔ جو ہم سے اتنے بیزار ہو۔ اپنے آگے
کی جوٹھن نالیوں میں پھینک دیتے ہو اور ہم کو بلا کر نہیں دیتے۔

ہاں اگر اپنی ڈھٹائی سے کوئی بلّا تمہارے ہاں پل جاتا ہے تو اس کے مزے ہی مزے ہیں۔ ایسا موٹا تازہ چکنا چپڑا ہو جاتا ہے جیسے کسی قومی اکھاڑے کا پہلوان یا کسی بڑے سرمایہ دار کی جوان بیوی کا بھائی۔ یا کسی یتیم خانہ کا مینجر یا کوئی بہروپیا مولوی۔ مسلمانوں کے بچوں کو البتہ ہمارے بچوں کا شوق ہوتا ہے۔ مگر نا عاقبت اندیش قوم کا شوق بھی عجیب ہوتا ہے شوق کا کوئی معیار نہیں۔ گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت پیار کرتے کرتے گودیوں میں بٹھاتے بٹھاتے ذرا مزاج بگڑا اور بوری میں بند کر جنگل میں چھوڑ آئے۔"

پنڈت جی ذرا کسمسائے اور نشے میں گھنی ہوئی آنکھیں ٹمٹما کر بڑی متانت سے بولے "مگر چوری تو بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔ فاقوں سے مر جانا اچھا اور چوری کرنا بُرا"۔

اتنا کہنے پائے تھے کہ بلا ایک چوہے پر جھپٹا مگر بڑ بڑ جو ہوئی تو آپ سنبھل کر بیٹھ گئے پھر وہی سماں سامنے تھا۔ بلا کسی قدر تُرش ہو کر بولا "چوری کو اچھا کون کہتا ہے لیکن ہماری چوری کا گناہ تمہاری گردن پر ہے۔ جب کوئی کھانے بیٹھتا ہے یا اس کے ہاں کوئی فالتو کھانے کی چیز ہوتی ہے تو پہلے ہم صورت سوال بن کر جاتے ہیں "میاؤں میاؤں" میں میں آؤں کہہ کر اس سے اپنی بھوک کا اظہار کرتے ہیں اور طرح طرح کی حرکتیں کر کے کھانے کو مانگتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی جتا دیتے ہیں کہ اگر تم نے بخل کیا یا ہمارا حق ہم کو نہیں دیا تو ہم چوری کریں گے پھر جب تمہاری بیدرد جنس ہماری حالت پر رحم نہیں کرتی بلکہ دھتکا دیتی ہے تو ہم مجبور ہوتے ہیں کہ چوری کریں۔ عجیب منطق ہے کہ ایک بھوکا اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کا سامان کرے تو مجرم کہلائے اس کو سزا دی جائے اور جو باوجود استطاعت محتاجوں کی خبر نہ لے بلکہ ان کو اپنے جبر و تشدد کا شکار بنائے اس سے کوئی باز پرس نہ ہو"۔

ترکی پنڈت کو پھر ذرا قومی جوش سا آیا۔ تیوری پر بل ڈال کر ارادہ کیا کہ اس زبان دراز بیکڑی باز بلے کو سزا دی جائے جھلا کر کہنے لگے۔ بس زیادہ شہد پن پر نہ اترو عقل کبوتر باز نہ شد کہ مادر خواہی کر کے چپ ہو رہے کسی اپنے بھائی سے واسطہ نہ پڑا ہوگا۔

یہاں ہاتھا پائی کا تو دم ہے نہیں، اور نہ یہ بھلے آدمیوں کا کام ہے۔ کھانڈ لپٹی ہوئی زہر کی گولیاں بھی دیکھی ہیں، اگر مجھ سے زیادہ آڑے تو ایک رات میں تم سب کے سب بیٹھے کے سوئے رہ جاؤ گے۔ اگر زندگی پیاری ہے تو ترلوکی سے ہاتھ نہ لاؤ۔ تمہاری یہ باتیں بالشویکوں کی سی ہیں سرمایہ داری کے خلاف تمہارا جہاد سوسائٹی کے لیے سخت مضر ہے۔

بلاچوہوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ طاق اور مچان پر سے کبھی کوئی ہنڈیا گرتی کبھی کوئی ڈبا۔ اب جو کونوں کا کنستر کھڑکا تو پنڈت جی کو بلے کے قہقہے کا گمان ہوا اور معلوم ہوا کہ وہ کہہ رہا ہے:۔

"آپ کی سوسائٹی سے ہمیں غرض؟ دولت مند سود خوار دنیا کو کیا فائدہ پہنچا رہے ہیں؟ سرمایہ دار اگر مٹ جائیں گے تو مفلسوں اور محتاجوں کا کیا نقصان ہوگا؟ مجھے کھانے کو نہ ملے تو میں تمہاری سوسائٹی کو لے کر کیا چولھے میں ڈالوں۔ سماج غریبوں کے لیے کب ہے؟ امیروں کی نمائش گاہ اور تہذیب کا قمارخانہ ہے؟ مفلسوں، کمزوروں اور مزدوروں کا تو وہاں کوئی درجہ ہی نہیں۔ سوسائٹی کے قانون میں افلاس، بھوک، شرم، دیانتداری اور کم گوئی ناقابل معافی جرم ہیں۔ چور کو سزا دینا اس کا فرض ہے لیکن چوری کے اسباب پر غور کرنا اس کا کام نہیں۔ چور کو سزا دینے کے مسئلہ پر مجھ کو بھی اتفاق ہے آپ چور کو چھ مہینے دو مہینے، سال دو سال کی نہیں، عمر قید کر دیجئے، بلکہ پھانسی پر لٹکا دیجئے، چشم ما روشن دل ما شاد۔ لیکن تعزیرات ہند میں یہ قاعدہ بھی داخل قانون ہو جائے کہ جو حاکم چور کو سزا دے وہ پہلے تین دن تک فاقہ کرے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اس کی آنکھوں کے سامنے بھوک سے بلکتے رہیں۔ اس پر اگر مجسٹریٹ یا جج صاحب اپنی خودداری کو قائم رکھیں اور ان کے دل میں چرا کر کھانے کا جذبہ نہ پیدا ہو تو ایک چور کو کیا بلکہ اس کے سارے کنبے کو سولی چڑھا دیں ـــ پنڈت جی مہاراج تم تو سب کھیل کھیل چکے ہو۔ عیش بھی کیا جیل بھی بھگتا۔ اپنے گھر کی ہولی دیکھی، غیروں کے دیے جلا کر دیوالی منائی۔ کوئی رنگ چھوٹا نہیں۔ پھر تم

نے کیا سمجھ کر دست پناہ اٹھایا تھا۔ میرے کہنے کا یقین نہ آئے تو تجربے کے طور پر سہی آج سے تین روز تک فاقہ کر دو۔ نہ افیون کھاؤ نہ سلفہ اڑاؤ۔ نہ دودھ پیو۔ غالباً تم نے ابھی کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ اپنی پچھلی روٹی میرے حوالے کر دو۔ اور ذرا فاقوں کا تماشا دیکھو۔ تین دن کے اندر اندر کیا تم تو تعلی جاتی ہے۔ کل شام تک ہی جو آدم کا کفن لمبا چوڑا لقمہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اگر نتھو مہتر کی ہنڈیا آنکھ بچا کر نہ لے جاؤ یا کم از کم گھاسی رام کی دکان کا تالا توڑ کر افیون نہ چرا لاؤ تو جتنا چاہے مار لینا۔"

مرزا گوہر

مرزا گوہر پوتڑوں کے امیر تھے۔ بچپن سونے چاندی کے پنگوڑوں میں گزرا۔ لڑکپن میں دولت سے کھیلے۔ جوان ہوئے تو باپ دادا کا اثاثہ بے دریغ اڑایا۔ پتنگ بازی مرغ بازی، بٹیر بازی غرضکہ کوئی بازی ایسی نہ تھی جس کا انھیں شوق نہ ہو۔ آنکھیں بند تھیں اور دل کھلا ہوا۔ کئی پشتوں کا بنا ہوا گھر تھا بگڑتا معلوم نہ ہوا۔ اپنی کمائی ہوتی۔ اپنے خون پسینے کا پیدا کیا ہوا پیسہ ہوتا تو خرچ کرتے ہوئے خیال بھی آتا۔ دوسرے کما کر چھوڑ گئے تھے۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ آخر کہاں تک۔ پوتڑوں کی امیری ٹھیکروں میں دم توڑنے لگی زیور گئے۔ شال دوشالے بکے۔ گھوڑے پالکی ناکی سب پر پانی پھر گیا۔ مکان جو محل سرا کہلاتا تھا بنیوں کی نذر ہو گیا تو ہوش آیا۔ آنکھیں کھلیں لیکن اب کیا ہوتا تھا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

حسرت

نہ کوئی لیاقت تھی نہ کچھ سلیقہ۔ نہ جسم محنت و مشقت کا عادی تھا نہ مزاج میں اعتدال

نوکری ملتی تو کس برتے پر۔ اور اگر مل بھی جاتی تو پرائی [illegible] کون کرتا۔

شرافت کا جھوٹا غرور۔ پدرم سلطان بود کا ذلیل کرنے والا نشہ۔ تباہ شدہ امارت کا ملال۔ پستی کی طرف لے جانے والی سیڑھیاں ہیں۔ سہارے کے بعد نادار کی حالت میں اگر انسان اپنی ہستی کو سمجھ سکے اور پرانی کہانیاں بھول جائے تو ہر قسم [illegible] ہو جاتی ہے لیکن عموماً

ایسا نہیں ہوتا۔ دولت و ثروت، تلذذ و تعیش کا اترتا ہوا نشہ ساری اولوالعزمیوں کو برباد کر دیتا ہے اور ان کی جگہ سستی، کاہلی، نامردی اور کم ہمتی پیدا ہو جاتی ہے۔ عالم اسباب میں بسر کرنے کی قابلیت نہیں رہتی۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح موت سے پہلے مرنا چاہتا ہے۔ اخلاقی گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیمیا کی تلاش میں خاک چھانتا ہے یا دنیا طلبی میں قدرت کی پوشیدہ طاقتوں کو مطیع کرنے میں زندگی برباد کرتا ہے تاکہ حاکم وقت مسخر ہو جائے۔ زمین چھپے خزانے اگل دے کوئی موکل روزانہ ایک اچھی رقم دے جایا کرے اور بدنصیب یہ نہیں جانتا کہ پوشیدہ دولت کے خزانے اور دست غیب صرف محنت، بلند خیالی اور کسب کمال میں مخفی ہے۔ ایسے ناکارہ اور قانون الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والے تو خسر الدنیا والآخرہ ہوتے ہیں۔

چنانچہ مرزا گوہر نے بھی تارک الدنیا بننے کے لئے یہ تمام درجے طے کر لئے تھے اور اب ان کے دن مزاروں پر فاتحہ پڑھنے، درگاہوں میں چلہ کشی کرنے اور عاملوں، فقیروں درویشوں کی تلاش میں گزرتے تھے اس کو یقین تھا کہ اگر میرا کوئی وظیفہ یا موکل پوری شرطوں کے ساتھ پورا ہو گیا تو ہفت اقلیم کا بادشاہ بن جاؤں گا۔ یہ نہ ہوگا تو کوئی کیمیا کا نسخہ باون تولے پاؤ رتی والا مل جائے گا۔ یہ بھی نہ ہوگا تو کم از کم دست غیب تو کہیں گیا ہی نہیں۔

خدا سے اس کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف خواہش اور اس کے انتظامات کو درہم برہم کرنے کی کوشش ایک سنگین جرم ایک ناقابل معافی گناہ ہے اگر اس کا رحم و کرم آڑے نہ آ جائے تو ایسے غدار سزا کے مستحق ہیں۔ مرزا گوہر بھی دنیا کھو کر اب دین کھونے کی فکر میں تھے۔ خدا کو یاد کرتے تھے محض دنیا کے لئے، نفس کشی ہو رہی تھی مگر صرف حصول عیش کی غرض سے۔ اگر اس میں اپنی غربت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی جرأت نہ تھی وہ قمار خانہ دنیا میں ہمت ہار چکا تھا تو کاش وہ خدا کو محض خدا کے لئے یاد کرتا جس کا سب کچھ ہے اور جس کی یاد دونوں جہان کی دولت کا مالک بنا سکتی ہے۔

مرزا گوہر نے سخت سے سخت ریاضتیں کیں دریا میں کھڑے ہو کر وظیفے پڑھے پہاڑ کے غاروں میں چلے کشیاں کیں مہینوں انسان کی صورت نہیں دیکھی ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ آدمی سے آدمی کا خاکہ بن کر رہ گئے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر قبرستان کی مسجد میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی انھوں نے ترس کھا کر مرزا گوہر کو ایک وظیفہ بتایا کہ یہ دعوت دردائیل کے متعلق ہے۔

مرزا گوہر:۔ تو مجھے اجازت ہے میں اسے شروع کر دوں۔

بزرگ:۔ بسم اللہ نوچندی جمعرات سے شروع کر دو دردائیل سے انشاء اللہ تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔

مرزا گوہر:۔ وہ میرے تمام مطالب پورے ہو جائیں گے۔

بزرگ:۔ تمہارے مطالب کا پورا ہونا خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔

مرزا گوہر:۔ یہ موکل خدا کی مرضی کو نہیں بدل سکتے؟

بزرگ:۔ توبہ توبہ! موکلوں کی کیا طاقت ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی اٹھا سکیں۔ بلکہ ہم درویش تو اسی کی پوشیدہ قوتوں کو موکل کہتے ہیں۔

مرزا گوہر: پھر آپ مجھ سے یہ محنت کس لئے کرانا چاہتے ہیں۔

بزرگ:۔ صرف اس لئے کہ تم برگشتہ ایمان ہوتے جا رہے ہو۔ تم نے اسمارِ الٰہی کی برکات نہیں دیکھی ہیں۔ تمہاری غلط اعتقادیوں نے تمہیں کفر کے دروازہ پہ لا ڈالا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں راندہ درگاہ نہ ہو جاؤ۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم خدا کے صرف ایک نام کی دعوت کا کرشمہ تو دیکھ لو۔

مرزا گوہر:۔ بجا ارشاد ہوا۔ مگر اس کے ذریعہ سے میری کوئی آرزو بھی پوری ہو سکے گی۔

بزرگ:۔ وہی علیم ہے۔ اسی کو اس کا علم ہے۔

مرزا گوہر:۔ لیکن دردائیل سے ملاقات کا مقصد؟

بزرگ: تمہارے مضطرب دل کی تسکین۔

یہ کہہ کر وہ بزرگ خاموش ہوگئے۔ مرزا گوہر نے ہر چند ان سے کچھ اور بات کرنی چاہی مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوسرے ہی لمحے غائب ہوگئے!

نوچندی جمعرات آگئی۔ مرزا گوہر نے سامان دعوت مہیا کر کے وظیفہ شروع کر دیا۔ ایک ہفتہ گزرا، دوسرا ہفتہ گزرا۔ تیسرا ہفتہ آیا اور ایسی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی جس سے اس دعوت کی کامیابی کا خیال ہوتا۔ چھ گھنٹے کی محنت۔ سخت پرہیز۔ دن بھر کا روزہ۔ چوکے صرف دو تولے ستو۔ خاموشی اور تنہائی۔ مرزا گھبرا گئے۔ جی چاہا کہ چلہ توڑ دیں لیکن صاحب عمل بزرگ نے کچھ ایسے تیوروں سے یہ عمل بتایا تھا کہ توڑنے کی ہمت نہ رہی۔ یہ بات بھی سنی ہوئی تھی کہ بعض اعمال اگر توڑ دئے جاتے ہیں تو ان کے الٹے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا عمل جاری رہا۔ آج تیسواں دن تھا اور چار گھنٹے پڑھتے ہوئے گزر رہے تھے کہ یکایک ساری مسجد ہلنے لگی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ زلزلہ آگیا۔ حجرے کے کواڑ ٹوٹے جاتے تھے۔ مہیب مہیب آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسا شور تھا جیسے آسمان سے پتھر کی ہزاروں سلیں برس رہی ہیں یا صدہا ریل گاڑیاں ہیں جو زمین کی چھاتی روند رہی ہیں۔ یہ ہولناک منظر لمحہ بہ لمحہ ترقی کر رہا تھا اور مرزا بے چارہ سہما سمٹا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور تسبیح چل رہی تھی کہ یکایک حجرے کے دروازے کو ایک سخت دھکا لگا اور دونوں کواڑ پاش پاش ہو گئے۔ مرزا کی جان خوف کے مارے نکلنے کے قریب ہی تھی کہ آہٹ سی معلوم ہوئی۔ اب وہ غل شور جاتا رہا تھا۔ سناٹا تھا اور خاموشی۔ مرزا نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک قوی ہیکل خوب صورت جوان نہایت بارعب ہتھیار لگائے اندر داخل ہوا۔ حصار کے آگے دو تین چکر لگائے اور تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا۔ مرزا نے زبان کی لے کو ذرا تیز کیا۔ چند منٹ تک ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ کہنے کے بعد اس آنے والے نے تیوری پر بل ڈال کر درشت لہجہ میں کہا۔

قضا و قدر سے مذاق کرنے والے ضعیف انسان۔ بول کیا چاہتا ہے؟ کیوں ہمیں پریشان کیا؟ ہمارے تسخیر کرنے سے تجھے کس فائدہ کی امید ہے؟"

مرزا کی جان میں جان آئی۔ وہ سمجھے کہ عمل کامیاب ہوا اور یہ دردائیل موکل ہے اب میری ساری تمنائیں پوری ہو جائیں گی۔ یہ دردائیل میرے سارے کام بنا دے گا۔ مسکرا کر بولے۔

مرزا گوہر:۔ آپ کا نام دردائیل ہے۔

موکل:۔ جی ہاں!

مرزا گوہر:۔ اللہ اللہ! کیسی کیسی زبان گھسی ہے کہاں کہاں انتظار کرتا رہا ہے جب آپ کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔

موکل:۔ ان فضول باتوں کو چھوڑ دو۔ مطلب کہو۔

مرزا:۔ جلد بازی نہ کیجئے۔ ابھی تو آپ تسخیر ہوئے ہیں۔

موکل:۔ تسخیر۔ تسخیر کیسی؟ یہ تو صرف اس پاک اسم کی برکت تھی جو ہم آ گئے۔ ورنہ دنیا کے بندوں سے ہمیں واسطہ۔

یہ فقرہ موکل نے ایسا کڑک کے کہا کہ مرزا پر ہیبت طاری ہو گئی اور کسی قدر لجاجت سے بولے۔

مرزا:۔ اچھا یہ تو فرمایئے کہ آپ اپنے عامل کی کیا کیا خدمت کر سکتے ہیں؟

موکل:۔ ہم کسی عامل کی خدمت کے لئے نہیں پیدا کئے گئے ہیں۔

مرزا:۔ تو پھر عملیات سے آپ کا تعلق کس قسم کا ہے۔

موکل:۔ صرف معنوی۔ ہر اسم میں ایک طاقت پوشیدہ ہے جس کو موکل کہتے ہیں چنانچہ جس اسم کی تم نے دعوت دی ہے اس کی مخفی قوت میں ہوں اور جس کا نام تم نے دردائیل مقرر کر لیا ہے۔

مرزا:۔ بہت خوب۔ لیکن کیا؟ آپ اپنے اسم کے عامل کی اطاعت نہیں کریں گے۔

موکل:۔ عملیات سے ہمارا تعلق اور عاملوں کی اطاعت جیسی لوگ سمجھتے ہیں وہ صرف دنیا طلب مکار اور ڈھکوسلے باز عاملوں کا جال ہے جیسا مشہور ہے ایسے نہ ہم کبھی کسی کے فرماں بردار تھے نہ اب ہو سکتے ہیں۔ لیکن جتنا بھی تعلق تھا وہ بھی ترک کر دیا ہے۔ یہ بھی اس بزرگ کی جس نے تم کو یہ اسم بتایا ہے روحانی طاقت کا کرشمہ تھا جو ہم آ گئے۔

مرزا:۔ تو اب آپ کا کیا کام ہے؟

موکل:۔ احکامات قضا و قدر کی انجام دہی اور بس۔ تم کہو تمہارا کیا مطلب ہے؟

مرزا:۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو کوئی خزانہ مل جائے۔ جدھر نظر ڈالوں دولت ہی دولت دکھائی دے۔

موکل:۔ یہی وہ نامعقول مطالبات ہیں جن کے سبب ہمیں عملیات کی اطاعت سے گریز کرنا پڑا۔ سونے چاندی کا ڈھیر لگا دینا یا کسی دفینہ کی جگہ بتا دینی ہمارے نزدیک کچھ مشکل نہیں لیکن اس قسم کے لغو کام مشیت الٰہی کے خلاف ہیں۔

مرزا:۔ اچھا تو مجھے کہیں کا نواب بنا دو تاکہ زندگی عیش و راحت میں گزرے۔

موکل:۔ اور ہوس کی شکارگاہ میں تم کو چھوڑوں۔ کیا خوب! پہلے ہی راجہ نواب کون سے حق حکومت و رعایا پروری ادا کر رہے ہیں جو تم ادا کرو گے اور بھیڑیئے غریب بکریوں کے لئے کیا کم ہیں کہ آپ کا بھی اضافہ کیا جائے۔

مرزا:۔ یہ بھی نہ سہی تو خیر کوئی کیمیا کا نسخہ ہی عطا ہو جائے۔ میں خود ہی سونا چاندی بنا لیا کروں گا۔

موکل:۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ تم کو خدا کے منشا کے خلاف بیکار اور جھوٹوں کا بادشاہ بنا دیا جائے۔ تم خود بن کر مخلوق کو گمراہ کرو اور بندگان الٰہی تم سے دھوکا کھا کر تباہ ہوں۔

مرزا:۔ میں تو محض دولت کا طالب ہوں۔ اسی کی خاطر یہ ساری محنتیں اٹھائی ہیں۔ دولت سے تمام خواہشیں پوری ہو سکتی ہیں اور آپ اس معاملہ میں میری کسی مدد کے لئے تیار نہیں۔

موکل: ۔ یہ تمہارا خیال غلط ہے کہ دولت سے خواہش پوری ہو سکتی ہیں۔ دولت تمنا برآری کا ایک ناقص ذریعہ ہے اور وہ بھی یقینی نہیں۔ اے ناقص العقل انسان تو اس چیز کو کیوں طلب کرتا ہے جو فانی ہے۔ جس کا زوال تو نے اپنی آنکھوں سے اپنے گھر میں دیکھا ہے جس سے نہ آج تک کبھی کسی کو بھی راحت میسر آئی ہے نہ روحانی لذت۔ بدنصیب یہ شیطانی وسوسہ ہے دل سے نکال ڈال اور اس کا طالب بن جس کے قبضۂ قدرت میں ایک یہ کیا ساری دنیائے آرزو اور کل کائنات مسخر ہے۔

مرزا: ۔ وہ کیا قارون کا خزانہ یا محمد شاہ رنگیلے کی بادشاہت ہے؟

موکل: ۔ لاحول ولا قوۃ۔ ارے وہ خدا کی محبت اور رسول کی اطاعت ہے۔

مرزا: ۔ مگر میں تو دولت کا آرزومند ہوں مجھے تو دولت مند بننے کی ضرورت ہے۔

موکل: ۔ کمبخت! اسمائے الٰہی کی توہین کرتا ہے! خیر اگر تجھ کو دولت دنیا ہی سے رغبت ہے تو دنیا کے قانون کے مطابق چل۔ کوئی ایسا کام اختیار کر جس سے مالدار ہونے کا راستہ کھل جائے۔

مرزا: ۔ حضرت اسی جھنجھٹ سے بچنے کے لئے تو میں نے عملیات کے پاپڑ بیلے ہیں۔ ان وظیفوں کا یہ پھل تو نہیں ملنا چاہیئے۔ کام کرنے کی ہمت ہوتی تو آپ کی دعوت میں جان کیوں کھپاتا۔

موکل: ۔ گدائے پست ہمتوں، دنیا کے ذلیل کتوں اور خدائی کے چور۔ کاہل کی اعانت کے لئے قانون فطرت میں کوئی دفعہ موجود نہیں ہے۔ یہاں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے کچھ نہیں ملتا اس جہان میں تدبیر سے تقدیر بنتی ہے۔

مرزا: ۔ آپ تقدیر بدل تو سکتے ہیں مگر مجھ سے آپ کو ضد ہو گئی ہے۔ خیر وہ کام ہی بتائیے جس سے دولت ہاتھ آئے۔ البتہ زیادہ محنت کی مجھ سے امید نہ رکھئے گا۔

موکل: ۔ آج کل طبابت، پیری مریدی، قومی پیشوائی اور فرقہ پرست وعظ گوئی یہ چار

پیشے ایسے ہیں کہ جتنی چاہو دولت سمیٹ لو۔ ان میں سے جس فن کو اختیار کرو گے میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔

مرزا :۔ آپ اچھے قضا و قدر کے فرشتے ہیں۔ دولت آپ نہ دے سکے نواب بنانے سے آپ نے انکار کر دیا۔ اکسیر بتانا آپ نہیں چاہتے۔ کام بتائے تو وہ کہ پہلے ساخت پرداخت یہاں اتنا صبر کہاں؟ اور کیا ان پیشوں میں فریب اور دغا نہیں ہے؟

موکل :۔ تمہاری کم ہمتی اور حرام خوری نے جب مال مفت کو ہی اپنی تقدیر سمجھ لیا ہے تو نہیں ایسے ہی کر سے دولت حاصل ہو سکتی ہے۔

مرزا :۔ لیکن ان کاموں کے لئے بھی تو ہنرمندی درکار ہے۔ میں تو اپنے میں نہ طبیب بننے کی قابلیت پاتا ہوں نہ پیری مریدی کی۔ قوم کا رہنما اور مذہب کا پیشوا ہونا تو بڑی چیز ہے یہ تو پکے دکان داروں کی باتیں ہیں۔

موکل :۔ اگر ان آسان اور بغیر ہلدی پھٹکری لگائے رنگ چوکھا لانے والے پیشوں پر تم ہاتھ نہیں ڈال سکتے تو خسرالدنیا والآخرہ ہو کر ٹھوکریں کھاتے رہو اور مر جاؤ۔ خلقت انسانی کو رسوا کرنے والے بندے آخرت سے غافل ہوتے ہوئے متروک الدنیا تو نہ بن۔ یہ مانا کہ طبیب بننے کے لئے کچھ نہ کچھ لیاقت کی ضرورت ہے۔ تھوڑا بہت روپیہ بھی چاہیئے۔ وعظ گوئی اور لیڈری بھی ذرا مشکل ہے۔ دوڑتے ہوئے دماغ اور چلتی ہوئی زبان کے بغیر یہ دکانیں نہیں چلتیں۔ علاوہ ازیں موجودہ سیاسی دور میں جہاں مار کھانے کا قومی اعلان ہے۔ پولس کی سختیاں، جیل کی صعوبتیں اٹھانے کی جرأت ہونی لازمی ہے۔ تم جیسے شخص کے واسطے تو بہترین کام پیری مریدی ہے جس میں نہ کسی ساز و سامان کی قید ہے نہ کسی قابلیت کا خرچ۔ بہت سی مسجدیں، خانقاہیں پرانے مقبرے ویران پڑے ہیں۔ جہاں جی چاہے جا بیٹھو۔ جتنی زیادہ بے ڈھنگی وضع اور جس قدر نرالی گفتگو اختیار کرو گے اسی قدر زیادہ لوگ گرویدہ ہوں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری

شہرت کے لیے کوشش کروں گا اور تھوڑے دن میں تمہیں پیر دستگیر۔ درویش، درویش سالک، مجذوب، قلندر، غوث، قطب جو کچھ تم چاہو گے بنا دوں گا۔ سینکڑوں ضعیف الاعتقاد مرد ہندو مسلمان، ہزاروں پرستار برقعہ پوش عورتیں تمہارے ہاتھ پاؤں چومیں گی اور تم مزے کرنا۔ فقیر بادشاہ کہلاؤ گے۔ اس ایک نسخے میں دولت، نوابی، کیمیا وغیرہ کی ساری خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔ فرمائیے کیا ارادہ ہے؟

مرزا:۔ کام تو ٹھیک ہے لیکن میرے بس کا نہیں۔ جگہ کی قید۔ ہر شخص سے نئے طرز کی گفتگو۔ ہر درد کا علاج ہر خواہش کی دوا۔ نہیں جناب مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ آپ تو ہمیشہ کے واسطے دست غیب کا انتظام کر دیں۔ زیادہ نہیں تو دو تین روپیہ روزانہ ہی سہی صبح ہوئی اور سرہانے سے اٹھا لیے۔

موکل:۔ ظالم! پیر فقیر یا درویش صاحب کرامت مشہور ہو جائے گا تو آنکھوں میں سرسوں پھول جائے گی۔ دست غیب کیا چیز ہے۔ دنیا کے سارے چھپے ہوئے خزانے نظر آنے لگیں گے۔ جب معتقد سہاگنیں اور نوجوان دیویاں مہندی لگے ہاتھوں سے پاؤں دبا دبا کر مرادیں مانگیں گی اور آنسوؤں کی زبان سے اپنے اخلاص کا اظہار کریں گی تو حوروں سے آنکھ لڑانے کو جی نہیں چاہے گا۔ کسی بیٹھک خانے میں یا کسی حسن فروش کی دکان پر جب ورق لپٹا ہوا پان پیش ہوگا اور روح افزا شربت کا ٹھنڈا گلاس سامنے آئے گا تو حضرت سرمست من شراب طہور کے جام زہر ہو جائیں گے۔ کہو کیا کہتے ہو؟

مرزا:۔ آپ بڑے ضدی ہیں۔ اچھا مجھے منظور ہے۔ عملیات کے شوق اور درویشوں کی صحبتوں کے سبب میرے لئے یہ زندگی بالکل نئی بھی نہیں ہے۔

موکل نے حقارت آمیز نگاہ سے مرزا کی طرف دیکھا اور نہایت غضبناک آواز سے یہ کہتا ہوا کہ اے معتوب ہستی جا اپنا کام شروع کر جیسی گندی کھیتی کی تو نے خواہش کی ہے ویسے ہی کڑوے کسیلے پھل بھی تجھے ملیں گے۔ خدا کی حقیقت سے تو نے گریز کی ہے

اس لئے وہ بھی ہمیشہ کے لئے مجھ سے روپوش رہے گی" غائب ہو گیا۔ مرزا نے دو برس کے عرصہ میں کئی روپ بدلے۔ پیر بنے عامل ہوئے۔ شہرت پائی۔ پورے عیش اڑائے چار دن کی چاندنی کے بعد جو اندھیرا شروع ہوا تو سارے کمالات خاک میں مل گئے وحشت ہو گئی اور مدت سے مادر زاد ننگے بازاروں میں پڑے پھرتے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ سمجھتا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ سب کے دائرے کے دھتکارے ہوئے کتے ہیں گھر کے نہ گھاٹ کے۔

رضائی

(ایک جاپانی کہانی)

"آئیے آئیے جناب تشریف لائیے" جاپان کی ایک چھوٹی سی سرائے کے مالک نے ایک مسافر کو سرائے کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

یہ معمولی سرائے بالکل نئی اسی دن مکمل ہوئی تھی اور آنے والا پہلا مسافر تھا۔ سرائے والے کی مالی حالت بہت گری ہوئی تھی۔ نیا سامان کہاں سے خریدتا۔ جتنی چیزیں چٹائیاں میزیں کرسیاں اور برتن وغیرہ تھے سب پرانے کباڑیوں کی دکان سے خریدے ہوئے لیکن تھی ہر چیز صاف ستھری اور سلیقے سے سجی ہوئی۔ مسافر نے آتے ہی کھانا مانگا۔ تھکا ہارا تھا کھاتے ہی سونے کے لئے لیٹ گیا۔

جاپان میں چارپائیوں کا رواج نہیں ہے سب زمین پر بستر لگا کر سوتے ہیں۔ بستر کیا ہوتا ہے؟ چٹائی اور چٹائی پر ہلکی پھلکی توشک۔ اس بستر پر وہ لیٹ کر موسم کے لحاظ سے ایک ایک دو دو اور تین تین پتلی پتلی رضائیاں اوڑھ لیتے ہیں۔ امیر آدمیوں کی رضائیوں کی لمبائی کوئی آٹھ فٹ اور چوڑائی سات فٹ ہوتی ہے۔ غریبوں کو جیسی میسر آجائیں۔ دن کو سو کر اٹھنے کے بعد یہ توشکیں اور رضائیاں تہ کر کے الماریوں میں رکھ دی جاتی ہیں۔ الماریوں میں کواڑ نہیں ہوتے ان پر کسی رنگ کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے۔ سر کے نیچے رکھنے کے لئے ان کے ہاں ہمارے جیسے تکیوں کا دستور نہیں۔ ان کے تکیے لکڑی کے

ایک خاص قسم کے ٹکڑے بچھے چاہییں اور وہ انھیں کچھ اس طرح سروں کے نیچے رکھتے ہیں کہ کروٹیں لیتے پران کے بنے ہوئے بال بگڑنے نہیں پاتے۔ جاپان اپنے تکیوں کی بڑی تعظیم کرتے ہیں۔ اگر بھولے سے کبھی کسی کا پاؤں تکیہ پر پڑ جائے تو وہ فوراً اسے اٹھا کر چومے گا اور معافی مانگے گا۔

اچھا تو مسافر بستر پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی اسے نیند آگئی۔ آنکھ لگے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کمرے کے اندر کچھ آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ ابھی سویا تھا نیند کچی تھی چونک پڑا اور دیدے کھول دیے۔ کان لگا کر سنا تو دو بچوں کے باتیں کرنے کی آوازیں تھیں ایک کہتا "کیوں بھائی جان کیا آپ کو سردی لگ رہی ہے؟ دوسرا جواب دیتا" میاں تم بھی تو ٹھنڈ کے مارے کانپ رہے ہو۔

مسافر نے خیال کیا کہ شاید سرائے والے کے بچے سردی سے بچنے تو نہیں آگھسے ہیں۔ جاپانی سراؤں کے کمروں میں کواڑ نہیں ہوتے کہ انھیں بند کر دیا جائے اور کوئی اندر آجا نہ سکے۔ زیادہ سے زیادہ حد بندی کے لئے کاغذ کے پردے لگا دیے جاتے ہیں

اندھیرا تھا مسافر کو سجھائی تو کچھ دیا نہیں۔ اس نے پڑے پڑے ہشت ہشت کرتے ہوئے کہا "بچو یہ تمہارا کمرہ نہیں ہے یہاں سردی میں کیوں اکڑ رہے ہو اپنی جگہ جاؤ۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ مسافر نے بھی آنکھیں بند کر لیں لیکن پلک سے پلک جھپکی ہی تھی کہ پھر آوازیں آنے لگیں "بھائی جان کیوں، کیا آپ کو سردی لگ رہی ہے؟"

"میاں تم بھی تو ٹھنڈ کے مارے کانپ رہے ہو"

مسافر کی نیند اڑ گئی۔ دل میں کہتا ہوا کہ "یہ کہاں کا عذاب آگیا انھیں نکالنا چاہیے" اٹھ بیٹھا۔ کاغذی قندیل اٹھائی اس کو روشن کیا اور کمرے کا کونا کونا چھان مارا۔ ایک ایک کر کے ساری الماریاں دیکھ ڈالیں۔ کوئی ہوتا تو نظر آتا۔ آدمی کے بچے تو ایک طرف کوئی جانور بھی نہ دکھائی دیا۔ حیران تھا کہ کیا معاملہ ہے جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا ہار کر اپنے بچھونے

پرتا لیٹا اور قندیل کو جلتا ہوا چھوڑ دیا۔

شر نکالنے کی دیر تھی کہ پھر ریکارڈ بجنے لگا آواز آنے لگی۔

"کیوں بھائی جان کیا سردی لگ رہی ہے ؟"

"میاں تم بھی تو ٹھنڈ کے مارے کانپ رہے ہو"

قندیل روشن تھی اور اس لئے مسافر نے دیکھا کہ یہ آوازیں الماری میں رکھی ہوئی رضائیوں میں کی ایک رضائی میں سے آرہی ہیں عریب کے اوسان جاتے رہے جب کسی کو اپنے آس پاس بھوت یا جن کے ہونے کا یقین ہو جائے تو اس نے دل کا حال اسی سے پوچھو۔ اب مسافر کو کمرے میں ٹھہرنے کی کیا ہمت ہوتی ڈرتے ڈرتے الماری کی طرف تکتکی لگائے جوں توں کر کے اپنا اسباب سمیٹا اور ایک دم کمرے سے بالکل بے حواس ہوکے والیکے پاس پہنچا

سرائے والا :۔ کیوں کیوں خیریت تو ہے۔

مسافر :۔ (ہانپتے کانپتے ہوئے) یہ تمہاری سرائے ہے یا بھوتوں کا ڈیرا ؟

سرائے والا :۔ (حیرت سے مسافر کا منہ دیکھ کر) آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟

مسافر :۔ تم نے آپ تو الماری میں کوئی بلا بند کر رکھی ہے اور مجھ سے پوچھتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

سرائے والا :۔ الماری میں بلا کیسی ؟

مسافر :۔ بلا نہیں تو کیا رضائیاں بولتی ہیں۔

اور اس نے سارا قصہ سنایا۔

سرائے والا :۔ واہ جناب واہ۔ اچھا اپنا مطلب کہئے میری سرائے کو بدنام کرنے سے آپ کیا لیں گے۔

مسافر :۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔

سرائے والا :۔ جوش میں آئیے۔ جھوٹ نہیں بولتے تو یقیناً آپ نے ایک بوتل سے کم نہیں چڑھائی ہے۔ ساور خانہ شراب کوئی تیز قسم کی ہوگی جس کے نشے میں آپ بہک رہے ہیں

بھلا آج تک کسی نے رضائیوں کو بھی بولتے سنا ہے۔

مسافر: یہ سب رضائیوں کو میں تب کہتا ہوں۔ صرف ایک رضائی بولتی ہے صرف ایک۔

سرائے والا: معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ بہانہ کرکے میرے پیسے دبانا چاہتے ہیں۔

مسافر: تم ہوشیار ہو یا انجان ہو۔ مسافروں کے ساتھ کیا اسی طرح پیش آیا کرتے ہیں۔ تمہاری اس بدزبانی کو کون مسافر گوارا کر سکتا ہے۔ لو اپنے پیسے سنبھالو۔ میں اب یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتا۔

مسافر نے اتنا کہہ کر سرائے والے کا حساب چکا کر دیا اور وہاں سے چلتا بنا۔

دوسرے دن سورج ڈوبتے ایک اور مسافر آیا اور رات کو ٹھہرنے کے لیے جگہ مانگی۔ سرائے والے نے بھی وہی کمرہ سونے کو دیا جس میں پہلا مسافر ٹھہرا تھا۔ مسافروں کو رات بھر کا بسیرا چاہیے، صبح کو سویرے اٹھ کر اپنی راہ لینی تھی۔ اس لیے یہ مسافر بھی جلدی جلدی کھانے سے فراغت پا سونے کے لیے لیٹ گیا۔ پلک جھپکی ہی تھی کہ بچوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا کچھ نظر نہ آیا۔ اجالا کیا پھر بھی کوئی صورت نہ دکھائی دی۔ نیند حرام ہو گئی۔ آخر بے حواس گھبرایا ہوا سرائے والے کے پاس آیا اور کہا کہ "میں نہیں مانوں گا تمہاری سرائے میں کوئی اسرار ہے۔"

سرائے والا: جناب، اسرار کیا۔ آپ نے کوئی خواب دیکھا ہوگا؟

مسافر: نہیں جناب میں نے جاگتے میں آوازیں سنی ہیں۔ پہلے آواز آئی "کیوں بھائی جان کیا آپ کو سردی لگ رہی ہے؟" پھر دوسری آواز نے جواب دیا "میاں تم بھی تو ٹھنڈ سے کانپ رہے ہو۔"

سرائے والا: (غصیلی آواز میں) واہ صاحب واہ! یہ اچھا دل لگی ہے۔ آپ لوگوں نے میرے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر لی ہے۔ ایک کل رات کو کہیں سے شراب پی کر آگئے تھے انھیں کمرے میں صرف بھوت ہی بھوت دکھائی دیے۔ آج آپ نے وہی کہانی دہرائی

شروع کر دی۔ نیکی کا وقت ہی نہیں۔ جتنی بھلائی کرو اتنی ہی برائی گلے پڑے اور کچھ نہیں تو میری سرائے میں بلائیں ہی لا بٹھائیں۔ ایک تو میں نے آپ لوگوں کے آرام کے لیے سرائے کھولی۔ زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کا سامان کیا۔ ایک ایک کمرے میں ایک ایک مسافر کو سلاتا ہوں یہ نہیں کہ آدمیوں کی پال ڈال دوں۔ پھر کرایہ بھی سب سے کم اور کھانے پینے کی قیمتیں بھی بہت ہی مناسب اس کا یہ بدلہ ہے کہ آپ مجھے پریشان اور میری سرا کو بدنام کرتے ہیں۔

سرائے والا اسی طرح بکتا جھکتا رہا اور مسافر اس کا حساب چکتا کر کے یہ جا وہ جا۔ دوسرا مسافر بھی چلا گیا تو سرائے والا سوچنے لگا کہ یہ کیا ہوا سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ کونسی بلا سرائے میں گھس آئی ہے آخر چل کر دیکھنا تو چاہیے۔ رضائی کا بولنا آج تک تو سنا نہیں جھینکتا پیٹتا غصہ میں بھرا ہوا ان رضائیوں کے پاس پہنچا جن میں سے آوازیں آنے کی مسافروں نے شکایت کی تھی۔ انھیں ایک ایک کر کے اٹھانے۔ جھٹکنے جھاڑنے لگا۔ یکایک ایک رضائی میں سے آوازیں آئیں۔

”کیوں بھائی جان کیا آپ کو سردی لگ رہی ہے؟“

”تم بھی تو میاں ٹھنڈے کانپ رہے ہو“

مصیبت زدہ آدمی موت سے بھی نہیں ڈرا کرتا۔ سرائے والے کا روزگار پٹ ہوا جاتا تھا وہ کیا ڈرتا۔ جس رضائی میں سے آوازیں آئی تھیں اسے اپنے کمرے میں لے آیا اور صبر سے بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ رات بھر رضائی میں سے وہی سوال و جواب کی آوازیں آتی رہیں اور وہ سنتا رہا۔ جوں توں کر کے رات کٹی۔ دن نکلا اور بازار کھل گئے تو سرائے والا اس بولتی رضائی کو بغل میں مار اس کباڑیے کی دکان پر پہنچا جس سے اس نے اس کو خریدا تھا۔

سرائے والا:۔ (رضائی دکھا کر) اس رضائی کو پہچانتے ہو؟

کباڑیا :۔ (الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے) پہچاننے سے کیا مطلب ؟

سرائے والا :۔ پرسوں تم ہی سے تو خریدی تھی۔ اتنی جلدی تو دکان دار اپنی بیچی ہوئی چیز کو بھول نہیں سکتا۔

کباڑیا :۔ (سرائے والے کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) اچھا تم اپنا مطلب کہو۔ کیا بات ہے ؟

سرائے والا :۔ مجھے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ تم نے اسے خریدا تھا کہاں سے ؟

کباڑیا :۔ تم یہ کیوں پوچھتے ہو۔ کوئی اس کا دعوے دار نکل آیا ؟

سرائے والا :۔ ایسی کوئی بات نہیں۔

کباڑیا :۔ پھر ؟

سرائے والا :۔ تمہارا بتانے میں کیا حرج ہے۔

کباڑیا :۔ چوک کے ایک پھیری والے دکان دار سے اور کہو۔

سرائے والا :۔ بس یہی پوچھنا تھا۔

اب وہ چوک کی طرف چلا اور پھیری والے سے ملا۔ رضائی دکھا کر اس سے اسی قسم کے سوال جواب کئے وہاں سے ایک اور نیلامول کا مال خریدنے والے کا پتہ لگا جس سے پھیری والے نے رضائی خریدی تھی۔ غرضکہ اسی طرح ایک کے پاس سے دوسرے کے پاس ہوتا ہوا آخر میں ایک کرایہ خوار یہودی قسم کے انسان سے ملا جس نے اپنے ایک کھنڈر جیسے مکان کے کرایہ کی بہت ہی چھوٹی سی رقم کے بدلے یہ رضائی وصول کی تھی یہ تو کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ امیروں غریبوں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان ایسی نامناسب سی صورتیں رات دن پیش آتی رہتی ہیں لیکن رضائی کے بولنے سے کیا واسطہ ؟ یہاں تک پہنچ کر اب ضروری تھا کہ اس مکان میں رہنے والوں کا کھوج لگایا جائے کہ وہ کہیں جنات میں سے تو نہیں تھے۔۔ تعاقب سے ایک ان کا

جانے والا بھی مل گیا اس نے بتایا کہ اس چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر میں دو معصوم بچے اپنے کم اوقات ماں باپ کے ساتھ رہا کرتے۔ کوڑھ میں کھاج بچوں کی ماں بیمار ہو کر کھٹیا پر پڑ گئی گھر میں ناج پانی ہی کا توڑا تھا۔ بیچاری کی دوا درمن کہاں سے ہوتی آخر بجھتے بجھتے غریب نے جان دیدی۔

بچوں کی عمریں کیا تھیں۔ ایک کوئی آٹھ برس کا ہوگا دوسرا چھ ساڑھے چھ سال کا۔ نہ پورے سمجھ دار نہ بالکل ناسمجھ روتے رہ گئے۔ میاں کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ افلاس کے ماروں میں اس کے سوا اور رکھا کیا ہے اور دکھوں کے ساتھ گھر کی رانی کی جدائی اور جدائی ناگہانی ادھر بچوں کی مصیبت اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اندر ہی اندر غم نے اسے چیر لیا اور ایسا پڑا کہ مر کر ہی اٹھا۔

اب گھر میں دونوں بھائی رہ گئے نہ کوئی سر دھرا نہ خبر لیوا۔ غریبوں کو کون پوچھے بیچارے بے یار و مددگار ایک ایک کا منہ تکتے سر جوڑ کر روتے اور بیٹھ رہتے۔ نہ خود کمانے کے قابل تھے نہ ماں باپ نے کوئی نقدی چھوڑی تھی کہ پیٹ بھرنے کا سہارا ہوتا۔ روزانہ گھر کی چیزوں میں سے کوئی برتن کوئی کپڑا بازار میں لے جاتے اور بازار کے ٹھگ جو کچھ اس کے بدلے دیدیتے لا کر اپنا گزارہ کرتے۔ امیر گھر تو تھا نہیں کہ بیچتے بیچتے بھی بھرا رہتا۔ دکھیاروں کی حیثیت ہی کیا۔ چند دنوں میں کورے گھڑے کے چوبے بن کر رہ گئے۔ ایک ایک کر کے ساری چیزیں پیٹوں میں چلی گئیں صرف ایک رضائی رہ گئی جسے دونوں بھائی رات کو اوڑھ لیتے۔

اسی اثنا میں ایک رات کو خوب برف پڑی۔ ٹھنڈی ہوا اور ٹوٹا ہوا مکان پھر ایک رضائی اور دو جانیں۔ اس پر طرہ یہ اس دن کھانے کو بھی کچھ نہیں ملا تھا پیٹ خالی تھے۔ گرمی آتی تو کہاں سے۔ دونوں بھائی سردی کے مارے ایک دوسرے سے چمٹ کر پڑ گئے اور رضائی اوڑھ لی۔ دھواں دھار برف پڑ رہی تھی

ہوا کے تیر کلیجوں میں اترے جاتے تھے۔ ایسی حالت میں نیند کیوں کر آتی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے رات بھر کانپتے رہے۔ چھوٹا بھائی بڑے کے دانت بجتے ہوئے دیکھتا تو کہتا "کیوں بھائی جان کیا آپ کو سردی لگ رہی ہے" بڑا جواب دیتا "میاں تم بھی تو ٹھنڈ کے مارے کانپ رہے ہو۔

ہوا سیلی ہوئی تھی اور رضائی کو دونوں بھائیوں نے چاروں طرف سے دبا رکھا تھا ان کی آوازیں کس طرف سے باہر نکلتیں۔ رضائی کی روئی میں جذب ہوتی اور اسی میں گونجتی رہتیں۔

صبح ہوتے خدا خدا کر کے برف پڑنی موقوف ہوئی۔ سورج نکلا لیکن یہ دونوں بھائی سردی کے مارے اسی طرح لیٹے پڑے تھے۔ اٹھنے کی ہمت نہ تھی کہ اتنے میں مکان دار تیوری چڑھائے آنکھیں نکالے آموجود ہوا۔ اسے مکان کا کرایہ نہیں ملا تھا اور بچوں سے ڈانٹ کر بولا۔

مکاندار :۔ کرایہ لاؤ۔ مہینہ ختم ہوئے آٹھ دن گزر گئے اور تم نے اب تک کرایہ نہیں دیا

بچے :۔ جناب ہمارے پاس روٹی کھانے کو ہے نہیں۔ کرایہ کہاں سے دیں۔

مکاندار :۔ کرایہ نہیں ہے تو مکان خالی کر دو۔ یہاں سے نکل جاؤ۔

بچے :۔ یہاں سے نکل کر کہاں جائیں۔

مکاندار :۔ جہنم میں :۔

بچے :۔ جہنم کا راستہ تو ہمیں معلوم نہیں۔

مکاندار :۔ بکو نہیں میں اب کچھ نہیں سنوں گا۔

بچے اٹھے اور اپنی رضائی سمیٹنے لگے۔

مکاندار :۔ (آنکھیں نکال کر) یہ رضائی کیوں اٹھائی!

بچے :۔ کیا یہ ہماری نہیں؟

مکاندار:۔ تمہاری کیسی رکان میں مفت رہے ستے۔ کرایہ دو ورنہ یہ رضائی اب میری ہے۔ کچھ تو وصول ہو۔

بچے:۔ جناب خیال تو فرمائیے۔ اس سردی میں ہم رضائی کے بغیر زندہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ کچھ تو رحم کرو۔

مکاندار:۔ زندہ رہو یا مرو مجھے کچھ واسطہ نہیں۔ رضائی چھین کر ہٹو۔ میں کچھ نہیں جانتا

سرمایہ داری انسان کو بے درد اور سخت تر بنا دیتی ہے۔ چنانچہ مکاندار نے بچوں سے رضائی چھین لی اور انھیں لات مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔ غریب بچوں کا کون حمایتی تھا بے چارے تن پر جو کپڑے تھے وہی پہنے ہوئے سردی میں سوں سوں کرتے نکل آئے مگر جاتے کہاں گھر میں رہتے ہوئے تو کسی نے پوچھا نہیں۔ اب کہ سر چھپانے کا ٹھکانا بھی نہیں رہا تھا کون پوچھتا۔ اسی مکان کے پچھواڑے جا کر برف پر لیٹ گئے۔ نیند آگئی مگر کیسی نیند؟ ابدی! جس کے سوئے ہوئے کی اس دکھ بھری دنیا میں آنکھ نہیں کھلا کرتی تھی

ایک شخص اسی وقت یا کچھ دیر بعد وہاں سے گزرا۔ اس نے دونوں کو اس بےبسی کی حالت میں برف پر پڑا ہوا دیکھا اسے رحم آیا۔ قریب گیا تو دونوں کو مردہ پایا۔ شاید وہ قدرت کی طرف سے اسی خدمت پر مامور تھا کہ بادشاہت بچوں کی نعشیں اٹھایا کرے اس نے دونوں بچوں کو اٹھا کر رحم کی دیوی کے مندر میں جس کا نام "کانون ہی" پہنچا دیا۔

اگر کسی جاپانی مندر میں تمہیں کانون کی مورتی کو دیکھنے کا موقع ملے تو تم دیکھو گے کہ ایک نہایت خوب صورت عورت ہے جس کے ہزاروں ہاتھ ہیں اور صورت ایسی معصوم گویا عصمت کی تصویر۔ کہا جاتا ہے کہ اس دیوی کو پرماتما نے جیتے جی جنت کے باغ میں بلانا چاہا۔ اس نے دیکھا کہ آسمان پر بہشت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور حوریں بلا رہی ہیں لیکن وہ وہاں نہیں گئی۔ اس نے اپنے ذاتی آرام و آسائش کی پروا نہیں کی۔ بلکہ ان ہزاروں دکھیا غمگین اور بیماروں کا خیال کیا جو اس دنیا کے کانٹوں بھرے

فرش پر بے کسی کی حالت میں دن گزارتے ہیں۔ اس نے ٹھان لیا تھا کہ اس دوزخی دنیا میں لاکر اپنے ہزار دل ہاتھوں سے کانٹے چنوں گی۔ پھول بچھاؤں گی اور خدا کے بے یار ومددگار بندوں کی خدمت کروں گی۔

قصہ مختصر ان دونوں معصوم بچوں کو بھی کانوں نے اپنی آغوش میں لے لیا اور جاڑے پالے کے مارے ہوئے یہ دونوں بھائی بھی رحم کی دیوی کے مندر میں دفن کر دئے گئے۔

سرائے والے نے جب یہ داستان سنی اور ان بچوں کی مصیبت کا قصہ معلوم ہوا تو اس کا دل بھر آیا۔ غریبوں کا درد اگر ہوتا ہے تو غریب کو۔ اور وہ ان کی رضائی لے کر فوراً مندر میں پہنچا۔ رضائی مندر کے پجاری کو دی اور رضائی کی کہانی سنائی۔ کہانی ایسی دردناک تھی کہ سنگ دل پجاری اور خود غرض آنے جانے والوں جس کے کان میں پڑی اس کے آنسو نکل پڑے۔ بچوں کی مصیبت بھری موت کے تصور نے تھوڑی دیر کے لئے سب کی گردنیں جھکا دیں۔

اب رضائی میں سے آوازیں آنی بھی بند ہو گئی تھیں۔ رحم کی دیوی نے انھیں تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ دوسرے اب زیادہ فریاد کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ بچوں کا پیغام دور نزدیک سب کو پہنچ چکا تھا اور لوگ اپنے دل میں نادم تھے کہ ان کی بستی کے دو معصوم بچوں نے سردی اور بھوک سے تڑپ تڑپ کر کس طرح جانیں دیں اور ایک بہائم صفت انسان نے کس طرح قانون سے مدد لے کر ان کی جانیں لیں۔

لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ واقعی وہ آوازیں بند ہو گئیں؟ جب تک دنیا سے سرمایہ داری کی لعنت نہیں مٹتی یہ آوازیں بلند ہوتی رہیں گی۔ کان لگا کر سنو آج بھی سردی کے دنوں میں ہزاروں [illegible] سے [illegible] ہوئے ایک دھیمے سے کہتے سنائی دیں گے۔

"بھائی جان یا میرے لال کیا تم کو سردی لگ رہی ہے؟"

"بھیا یا بی اماں آپ بھی تو ٹھنڈ کے مارے کانپ رہی ہو"

وہ بستی یا وہ زمانہ محض یہودیوں کی بستی یا زبردستی کا زمانہ تھا۔ اب بھی ہر جگہ اور ہر وقت خدا جانے کتنے غریب، لاچار، دکھیارے اندھیری جگہوں تاریک مکانوں میں پیٹ سے پتھر باندھے سردی سے ٹھٹھرتے ہیں۔ ان کے پاس نہ اوڑھنے کو ہے نہ بچھانے کو۔ ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ نہ پیٹ بھرنے کو روٹی میسر ہے نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔ نہ چولھے میں آگ نہ چراغ میں تیل۔ نہ خود کھا سکتے ہیں نہ اپنے بال بچوں کو کھلا سکتے ہیں۔ نہ ان کے لئے گرمی میں سکھ ہے نہ جاڑے میں۔ دکھ بیماری آ جائے تو مرنے سے پہلے چھٹکارا نہیں ملتا۔ غرض کہ وہ جیتے ہیں مگر مر مر کر۔ اگر ان کے پھٹے پرانے بستر اور پیوندلگی جیبیں، ضانی کی طرح ان کا حال کہنے لگیں تو ہر جگہ کیا گاؤں کیا قصبے کیا بڑی بستیاں اور کیا چھوٹے شہر، ان کی آوازیں ریڈیو کی صدائیں بن جائیں۔

اچھا تو کیا اس وقت ہزاروں ہاتھوں کو ان کی مدد کے لئے بڑھنا نہیں چاہیئے رحم کی دیوی! کیا تو نے بھی اپنے ہاتھ سمیٹ لئے؟ سرمایہ داری بڑھتی جا رہی ہے غریب مزدوروں کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہودی ان کا خون چوسے چلے جاتے ہیں ضرورت ہے کہ تو اپنے ہاتھوں کو بڑھا اور دکھیاروں کی مدد کر۔

زندگی کی اندھیری راتیں

بچپن کی رات

قسمت کے ستارے کبھی ماں کے پیٹ ہی میں ماند پڑ جاتے ہیں۔ نہ اقبال کا سورج چمکتا ہے نہ خوش وقتی کے چاند کی روشنی ہوتی ہے۔ راحت ابھی اندھیری کوٹھری میں تھا کہ باپ کو سانپ نے ڈس لیا غربت کی حالت پیسہ پاس نہیں۔ ہسپتال میں موت ہوئی۔ ہاجرہ بیچاری لاوارث ہو گئی، نہ سر چھپانے کا ٹھکانہ رہا نہ گزرنے کا سہارا۔ ابھی عدت ہی میں تھی کہ بیماری نے آگھیرا دوا درمن کون کرے۔ پڑوس میں ایک بی بجن رہتی تھیں۔ ترس کھا کر انھوں نے ہاجرہ کو اپنے گھر رہنے کو جگہ دیدی تھی۔ لیکن دنیا میں چلتے ہوئے ہاتھ پاؤں کا ہر کوئی ہوتا ہے یہ تھک جائے یا ٹوٹ جائے تو نہ ماں بیٹی کو پوچھتی ہے نہ بیٹی ماں کو۔

بی بجن کیسی ہی رحم دل سہی کوئی خون کا تعلق تو تھا نہیں کہ ہاجرہ کی معیت کو خوشی سے سہتیں اور اگر صرف ان کی ذات کا واسطہ ہوتا تو شاید برداشت بھی کر لیتیں۔ مگر گھر کے دوسرے لوگوں نے ان کو تنگ کرنا شروع کیا اور وہ مجبور ہو گئیں کہ لاوارث ہاجرہ کو رخصت کریں ایک دن بی بجن آنکھوں میں آنسو بھرے ہاجرہ کے پاس آئیں دیکھا تو وہ تڑپ رہی ہے۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو شدت کا بخار تھا۔ حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ درد ہے۔ قریب ہی ایک حکیم صاحب رہتے تھے انھیں بلا لائیں۔ کیفیت بیان کی۔ حکیم صاحب نے نبض

دیکھ کر کہا کہ یہ تو دردِ زہ کے آثار ہیں اور معمولی سا نسخہ لکھ کر چلے گئے۔ شام ہوتے ہوتے بچہ پیدا ہوا۔

بیماری۔ سوگواری اور فاقہ کشی کی اولاد جتنا سوکھا سہما چھوٹا ہوتا کم تھا۔ ادھر وضع حمل کے کچھ دیر بعد ہی سے ہاجرہ کے تیور بگڑنے لگے۔ بی حجن گھر والوں کی چہ میگوئیوں سے پہلے ہی بدمزہ تھیں اب اور بھی گھبرا گئیں لیکن کیا کرتیں صبر و شکر کر کے کبھی بچے کو گھٹی پلاتیں اور کبھی زچہ کے سانس گنتیں۔ تیسرے روز غریب ہاجرہ کا خاتمہ ہوگیا جس طرح بنا بی حجن نے محلے والوں کی مدد سے اس کو گور گڑھا کیا۔ رہا بچہ اسے کون پالے؟ عورتیں مرد سب بیزار نہ دیکھتے بنتی تھی۔ نہ پھینکتے۔ آخر بڑی بی ہی نے ہمت کی اور میاں راحت کو کلیجہ سے لگا لیا۔

سارے گھر کی دُر دُر پھٹ پھٹ میں راحت کی پرورش ہو رہی تھی۔ بی حجن کے سوا کوئی خبر گیراں نہ تھا۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب اس کی جان کے لاگو تھے دودھ کے لیے پہروں تڑپا کرتا۔ ننھی سی جان گھنٹوں بلکا کرتی اور کسی کو رحم نہ آتا بلکہ تھپکنے اور دودھ پلانے کے بدلے ہزاروں کوسنے اور لاکھوں گالیاں پڑتیں اس پر بھی دل ٹھنڈا نہ ہوتا تو چٹکیاں لیتے اٹھا اٹھا کر پھینک دیتے۔ ایک بڑھیا اکیلی کس کس کی زبان بند کرتی اور کس کس کے ہاتھ روکتی لیکن جس کو خدا رکھے اس کو کون چکھے۔ راحت میاں کا بال بیکا نہ ہوا اور وہ اسی ببول کے پنگورے میں پلتے اور بڑھتے رہے۔۔۔ یہاں تک کہ پرائی ٹھوکریں کھا کھا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے لگے اور زبان بھی کھل گئی۔

ماں کی محبت تھی نہ باپ کا سایہ۔ کون معصوم راحت کے مان رکھتا اس کی تمنا پوری کرتا توتلی زبان سے باتیں سن کر منہ چومتا اور مٹک مٹک کر چلنے پر واری قربان ہوتا۔ بی حجن کو پالنے کا خیال تھا تو وہ گھر والوں کے ڈر سے دل ہی دل میں خوش ہو کر رہ جاتی تھیں۔ زبان سے ذرا بھی کچھ کہتیں تو پیچھا چھڑانا دشوار ہو جاتا۔ راحت لاوارث

ہو گیا تھا تو اس میں اس کی کیا خطا۔ مگر نہیں دنیا میں یتیم ہو جانا ہزار گناہوں کا ایک گناہ ہے۔ اس کی قسمت میں ٹھوکریں ہی ٹھوکریں ہوتی ہیں۔ راحت جوں جوں بڑا ہوتا گیا انسانی ہمدردی کم ہوتی گئی۔ گالیوں اور کوسنوں کے علاوہ اب اس پر مار بھی پڑنے لگی۔ روٹی کپڑا تو کوئی کیا دیتا دو دو پہر پانی کو ترسا کرتا۔ بڑے حلال خوار اور چمار کے بچوں سے زیادہ حقیر سمجھے پاس آیا اور کتے کی طرح دھتکارا۔ بچے کھیلتے ہوتے اور یہ ان کے پاس چلا جاتا تو وہ اسے دھکے دیدیتے۔ غرضکہ میاں راحت کی ہستی ٹوٹے ہوئے کھلونے سے بھی بدتر تھی۔

پیٹ بری بلا ہے۔ بچہ ہو یا بوڑھا کھانا سب کو چاہیے۔ جب تک راحت کے پاؤں نہ تھے اور وہ زبان سے بول نہیں سکتا تھا بے بسی تھی۔ بھوک لگتی۔ روتا بلکتا اور رہ جاتا۔ لیکن اب اس کو وہ مجبوریاں نہ تھیں گھر میں کھانے کو نہ ملتا تو باہر نکل جاتا۔ ادھر ادھر چرتا رہتا۔ اور جانوروں کی طرح گری پڑی سڑی بسی چیزوں کو اٹھا کر کھانے سے دریغ نہ کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کا ہاتھ بھی پھیلنے لگا۔ فقیروں کو مانگتے کھاتے دیکھ کر اس نے مانگنا شروع کر دیا۔ بی حجن کے گھر والے تو خدا سے چاہتے تھے کہ یہ پاپ کٹ جائے۔ انھوں نے آوارگی کا الزام لگا کر میاں راحت کو باہر ہی نکال دیا۔ بڑی بی کب تک اس کی حمایت کرتیں وہ بھی خاموش ہو گئیں اور ایک معصوم زندگی باقاعدہ گداگری میں بسر ہونے لگی۔

ہندوستان میں فقیروں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ہر ایک کی وضع الگ اور ڈھنگ جداگانہ۔ ذلیل سے ذلیل حالت سے لیکر بڑی بڑی شان کا فقیر دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن از اول تا آخر یہ سب ملک پر ایک ناقابل برداشت بوجھ۔ ان پیشہ ور بھک منگوں میں ایسے بدکاروں اور بدمعاشوں نے بھی پناہ لے لی ہے جو سوسائٹی سے راندہ اور جرأت و ہمت سے درماندہ ہو چکے ہیں۔ چوروں اور ڈاکوؤں سے انکی

ساز باز ہے اور یہ ان کے لیے کھانگیوں کا کام کرتے ہیں۔ چھوٹے بچے اور اپاہج
عورتیں ان کے مقاصد کی کنجیاں ہیں۔ انھیں ہمیشہ اپنی ٹولیوں کو بڑھانے کا خیال
رہتا ہے۔ جہاں کوئی لاوارث برقعہ پوش عورت دکھائی دی یا کسی آوارہ گرد بچے
کو پایا انھوں نے منگوا لیا۔

رحمت پر اس قسم کے ہر فقیر کی نظر پڑتی تھی۔ یہ بھی جمعہ اور جمعرات کو ان کے ساتھ
دور دور نکل جاتا۔ بچوں میں نقالی کا عجب مادہ ہوتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے میاں رحمت
طرح طرح کی صدائیں لگانے لگے اور وہ سارے ڈھونگ انھوں نے بھی سیکھ لیے۔
جن پر ایک بھکاری کی کامیابی منحصر ہے۔ یہاں تک کہ ایک جرائم پیشہ فقیروں کی ٹولی
نے انھیں اپنے میں ملا لیا۔ اب کیا تھا باقاعدہ سوالی بن گئے۔ کھانے کی کمی نہ تھی
پہننے کو جس کی اترن چاہی پہن لی۔ شہر کے باہر ایک پرانے تکیے میں ان کا قیام
تھا۔ یہاں کے تکیہ دار کی نسبت مشہور ہے کہ بڑا دھاڑی چور تھا۔ سو سو کوس میں
اس کی دھاک تھی بڑے بڑے دھنا سیٹھ اس کے نام سے کانپتے تھے۔ پولس برسوں پیچھے
پیچھے پھری مگر یہ ہاتھ نہیں آیا۔ آخر متھرا میں ایک مندر پر سے کودتے ہوئے ٹانگ
ٹوٹ گئی اور پکڑا گیا۔ برسوں جیل میں رہنے کے بعد جو نکلا تو نیچے کا دھڑ بیکار تھا۔ ہمارے
ہاں کوئی محتاج خانہ نہیں۔ سرکار نے کوئی ایسا انتظام نہیں کر رکھا کہ برائیوں سے توبہ
کرنے والوں یا جو ارتکاب جرم کے قابل نہ رہے ہوں انھیں پناہ میں لے لیا جائے
تاکہ وہ امن کی زندگی بسر کر سکیں اور پیٹ کی خاطر جرائم کی نوعیت نہ بدلیں۔ جب
کوئی گنہگار ترک گناہ کے بعد دنیا کو اپنے لیے تنگ پاتا ہے تو اس کے جذبات گناہ
زیادہ تیز ہو جاتے ہیں۔ آلات گناہ بیکار ہو جائیں بلا سے وہ اپنے دماغ سے کام
لیتا ہے اور اس لازمی مرض کو متعدی بنا کر سوسائٹی کو تباہ دینا چاہتا ہے کہ تم نے مجھے
اکیلے تو دھتکارا ہے، میں تمھارے لیے شیطانی لشکر تیار نہ کر دوں تو نام نہیں

پہلے تو اِدھر اُدھر مارا مارا پھرا۔ جب کسی نے نہ پوچھا تو اس تکیے کو سنبھالا اور مزے میں دوس
جیبوں کو کھلا کر کھاتا ہے۔

اس تکیے میں دنیا کی اندھیری سے اندھیری راتیں جمع تھیں۔ رات دن چھوٹے اللہ والوں کا میلا لگا رہتا تھا۔ روزانہ بیسیوں رنگ برنگ کے درویش آتے تھے اور چلے جاتے تھے سیروں چرس اڑ جاتا تھا اور پنسیریوں بھنگ گھٹ جاتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کا صبح سے شام تک تانتا لگا رہتا تھا۔ سینکڑوں چیزیں لُٹ جاتی تھیں جیسے میں دو چار واقعات لڑکیوں کی بالیاں اتر جانے اور کسی نوجوان عورت کی آبروریزی کے بھی ہو جاتے تھے۔ لیکن اس سے کہیں خوش اعتقادی میں فرق آتا ہے۔ مرادوں والا تکیہ یوں ہی تو مشہور ہوا تھا کہ جو مراد مانگی جاتی تھی پوری ہوتی تھی۔

یوں تو دن کو بھی اس تکیہ میں چراغ گل پگڑی غائب ہوتی رہتی تھی لیکن رات کا سماں تو خاص کر انتہائی بھیانک ہوتا تھا کہیں چرسے کے پھرتے ہوئے ہیں کہیں چوری کا مال تقسیم ہو رہا ہے۔ ایک طرف قاتل اپنی کارستانیاں بیان کر رہے ہیں تو دوسری طرف جیب کتروں میں پیچ پیچ ہو رہی ہے تکیہ دار بوڑھا خرانٹ کسی کو ڈانٹتا ہے تو کسی کی تعریف کرتا ہے۔ انہی میں میاں راحت بھی چاندی کے تعویذ پیش کرتے ہیں جو انھوں نے کسی شادی والے گھر میں ایک لڑکی کے گلے سے اتارے تھے۔ اس تکیے میں انھیں جیب کترنے کی تعلیم دی جاتی ہے اور معمولی ہدایتوں کے بعد سب اپنے اپنے دھندے سے لگ جاتے ہیں۔

درخت کی ہری شاخ میں ایک قسم کا لوچ اور لچک ہوتی ہے جس وضع کا چاہو اسے بنا لو۔ بالکل اسی طرح انسان بھی اپنی کچی عمر میں اچھے یا برے نمونوں پر ڈھالا جاتا ہے۔ جیسی تربیت ویسی اس کی اٹھان۔ راحت کو کون سی اچھی صحبت ملی تھی جو وہ نیک بنتا آنکھ کھول کر اس نے تو یہی ذلیل زندگی دیکھی تھی۔ اس کے نزدیک دنیا میں بسر کرنے کا

ایک ہی طریقہ تھا۔ تم اُچکا کہو یا چور معاش راحت کے حق میں تو یہی سب کچھ تھے۔ ان میں ہمدردی بھی، محبت بھی اور راحت اپنی چیزوں کا بھوکا تھا۔ رہا سوسائٹی میں اُن کی وقعت کا سوال تو سوسائٹی پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈالے یہ کیا کہ مرض کا تو علاج نہیں، اور مریض سے نفرت۔ فاسد خون کو دور کرنے سے غافل لیکن اگر انگلی پکنے لگے تو ہاتھ دھونے کو تیار۔ سبحان اللہ کیا مطمح نظر ہے۔

خوشکہ میاں راحت تھوڑے دن میں شاگرد سے استاد ہو گئے۔ شہر میں دھوم مچ گئی۔ پرانے پرانے کام کرنے والے اس کی سبک دستی پر غش غش کرتے تھے۔ کو ہل کرنے میں وہ ملکہ بہم پہنچایا کہ گھونسوں کو مات کر دیا۔ چلتے چلتے دکانوں پر سے مال اڑا لینا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس مرتبہ آپس کی لاگ ڈانٹ سے دو چار مرتبہ پکڑے بھی گئے اور دو ایک مرتبہ بینتیں بھی کھائیں لیکن وہ جو کہتے ہیں "بدنام ہوا تھا نخیر نہنگ ادب ہو گیا" سزا کی جو دل میں ایک دھڑکن تھی وہ بھی نکل گئی۔ گویا امتحان داخلہ میں کامیابی کے ساتھ تھا۔

جوانی کی رات

ایک تو رات اندھیری اوپر سے چھا گئی گھٹا۔ صرف کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔ ورنہ تاریکی میں کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ میاں راحت جوانی کی تاریکیوں سے ہم آغوش ہوئے۔ بے حیائی، نشہ بازی، حرام خوری، جہالت، سیاہ کاری کے سارے سامان تیار تھے۔ ایک صرف مال مفت اور جوانی کی کسر تھی۔ ان میں سے دولت تو چوری، ڈکیتی اور جیب بری کے صدقے میں ہاتھ آئی اور شباب فطرت کی فیاضی نے عطا کیا جتنے گل کھلاتے کم تھے۔ اندھیرے اجالے جنہیں لوٹ جائے شمعوں کو شمعوں پر اُن کا راج تھا تو جنگلوں میں ان کی حکومت۔ جہاں ڈولی اترتی وہاں برقعہ اتار لیا۔

آخر بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ رات کے گیارہ بجے رام لیلا سے واپسی پر ایک کمہاری پر ہاتھ ڈال دیا۔ سمجھے تھے اکیلی ہے پیچھے سے نکلا تو اس کا جلوہ۔ عورت جوڑ کا کانٹا ہو گئی اس وقت تک نہ چھوڑا کہ اس کے ساتھی نہ آ گئے۔ خوب کریا کرم ہوئی جوتا اور چار

ہاتھ بغیر لگائے نہ رہتا۔ سپاہی دوڑ پڑے۔ ایسی گچی مار ماری کہ میاں راحت کی صورت بگڑ گئی اور پھر سارا غول انہیں گھسیٹتا ہوا تھانے لے گیا۔ تھانہ والوں کی بیدردی اللہ کی پناہ۔ دان سے جتنا پیٹا گیا پیٹا اور جب تھک گئے تو کھینچ کر حوالات میں بند کر دیا۔ اس سے کیا غرض کہ ملزم مر گیا یا جیتا ہے اور جرم کی نوعیت کیا ہے۔

صبح ہوئی تو راحت بیہوش تھا۔ سارا بدن سوجا ہوا۔ منہ سے خون جاری۔ تھانیدار صاحب کو رپورٹ ہوئی اور ضمنی کے ساتھ یہ ادھ موئی لاش چارپائی پہ ڈال ہسپتال بھیج دی گئی لاوارثوں کو ہسپتال میں کون پوچھتا ہے۔ لیکن سخت جانوں کا وہاں بھی کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ بدسلوکیوں اور بے احتیاطیوں کے باوجود راحت کی چوٹیں اچھی ہو گئیں۔ دو دن جیسے ہسپتال کا بستر روند کر اٹھے تو چالان ہوا۔ دو سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ جیل پہونچے چکیاں پیسیں۔ بان بٹے۔ ٹوکریاں ڈھوئیں۔ قید کے دن پورے کر کے نکلے تو پھر وہی اندھیری رات تھی۔ فرق صرف اس قدر ہوا کہ پہلے اچکے ہاتھ مارتے تھے اب لمبے دھاوے لگانے لگے۔ بٹماری ترک کر کے دہشت انگیزی اختیار کر لی تھی ——— رامپوریوں اور سود خوار پٹھانوں نے کریلے کو نیم پر چڑھا دیا تھا گویا کالی اندھیر۔ دھواں دھار ابر میں چھادنیں بھی برسنے لگی تھیں۔

چور ہو یا سادھو۔ بدمعاش ہو یا نیک معاش۔ زندگی کا کوئی معیار ہونا چاہیئے۔ برا بھلا ہر پیشہ اپنے اندر ایک شرافت رکھتا ہے۔ بدکار سے بدکار ایک مخصوص کیرکٹر کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن راحت میاں کے دل کی تاریکی میں ایک بھی روشن ذرہ نہ تھا۔ کوئی وضعداری۔ نہ ان میں نہ حق وہ اپنی دغابازیوں سے کسی گروہ میں اپنا ٹھکانہ پیدا نہ کر سکے اس لئے آج تک نہ ان کے بڑے سے کوئی جگہ تھی نہ برے وقت میں کوئی آڑے آنے والا۔ بلکہ شہر کی تمام جرائم پیشہ پارٹیاں ان کو اپنے لونڈے کی مدد بھی سمجھتی تھیں۔ پولس کے رجسٹروں میں ان کا نام درج ہی تھا۔ ہر واردات میں ان سے باز پرس ہونی ضروری تھی۔ خدا کا کرنا ایسا

ہوتا ہے کہ ایک رات کوئی نوجوان مارواڑی ریل سے اترا۔ یہ مسافر خانہ میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اس کی گھبراہٹ نے انھیں متوجہ کر دیا۔ باہر نکلتے نکلتے ساتھ ہو لیے۔ انگلیوں پر نظر پڑی تو چمکتی ہوئی انگوٹھیاں تھیں۔ باتوں کا ایسا تسمہ باندھا کہ اس نے ساری بھید کی باتیں بتا دیں۔ معلوم ہوا کسی طوائف پر لٹو ہیں اور ماں باپ سے چھپ کر عیاشی کرنے آئے ہیں۔ راحت کے ہاتھ سونے کی چڑیا لگی اور یہ اسے دم جھانسہ دے کر اپنی آشنا کوٹھے والی کے کوٹھے پر لے آئے۔ خوب شراب پلائی اور رات کے اندھیرے میں صبح ہوتے ہوتے غریب عاشق کے ٹکڑے کر کے پرانے کوٹھے کے پچھواڑے جھاڑی تراڑی میں دبا آئے۔

دوسرے دن کسی سادھو نے پولس کو اطلاع دی۔ تفتیش شروع ہوئی۔ یہ کیس کے تھے جو کوئی ان کا ہوتا۔ کوکی ناک پہ پہلے ہی ہاتھ صاف کر چکے تھے بھید کھل گیا گرفتار ہوئے پھانسی تو مقدمے کی کسی خامی کے سبب ہوئی نہیں چودہ برس کو کالے پانی بھیج دیے گئے کالے پانی کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہاں کیسے روسیاہوں کو گزر ہوگا۔ ہندوستان سے جو تیرہ بخت اس قید خانے میں جاتے ہیں وہ اول تو زندہ نہیں آتے وہیں سے اندھیرے اندھیرے منہ کالا ہو جاتا ہے اور جو کوئی ایسا ہی سخت جان ہوا کہ جیتا جاگتا واپس آ گیا تو پھر عموماً اس کے دوزخ کا فرشتہ ہونے میں کسر بھی نہیں رہتی۔

کالے پانی پہنچ کر راحت کو ان زمین و آسمان ہی دوسرے نظر آئے۔ چاروں طرف دریائے شور کا کالا پانی نمکین اور بساندی ہوا جو ملاخولی۔ ڈاکو۔ عورتیں مرد سب سیاہ قلب۔ ایک ایسا مذبح تھا جہاں انسان ذبح تو نہیں ہوتے مگر ان کی روحوں پر رات دن عذاب رہتا ہے۔ ہفتوں گزر گئے اور میاں راحت کی دلبستگی کا سامان نہ پیدا ہوا وطن کے جیل خانوں کی سی یہاں بات کہاں؟ سخت سے سخت قید میں بھی عادتیں پوری ہو جاتی تھیں۔ چرس موجود۔ شراب حاضر۔ جس جگہ چار مل گئے جوا ہونے لگا۔ روزانہ شہر کی خبریں سن لو۔ بیسیوں نئی اسامیوں کے نام معلوم ہو جاتے تھے، ہمجولیوں کا۔ منا تھا ایک

آرہا ہے دوچار رہے ہیں۔ تاہم انھوں نے اپنی کاریگری یہاں بھی دکھائی آہستہ آہستہ کچھ عورتوں اور مردوں کو ملاکر ایک چھوٹی سی ٹولی بنالی۔ فطرت گندی تھی جس پانی میں رہیں اسی کے ساتھیوں کو ڈسیں۔ پہلے سال ایک سیاسی قیدی کے کپڑے چرالیے قیدی ان پر غیر معمولی طور پر مہربان تھا۔ خدا معلوم کیوں؟ کیا توقعات ان سے وابستہ ہوگئی تھیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ البتہ انھوں نے اس کی مہربانی کا بدلہ ادا کردیا سزا بھگتی

دوسرے سال ایک ادھیڑ بنگالن پر ہاتھ ڈال دیا وہ کئی خون کرکے آئی تھی۔ اس نفس پرست چور نے کیا دھوس کھائی۔ ایک ایسا پتھر رسید کیا کہ میاں سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور لوگوں کے آتے آتے چھاتی پر چڑھ کر دانتوں سے ناک کتر لی۔ یہ شیرنی تو پنجرے میں بند ہوگئی یا نہیں۔ کچھ ہوا ہوگا لیکن راحت صاحب مہینوں ہسپتال میں رہ کر بھی تو ناک پر پھایا لگایا ہوا تھا خدا جانے اس عورت کے دانتوں میں کیا بلا تھی کہ مرتے مرتے یہ زخم بہتا ہی رہا۔ کالے پانی میں نکو بنے اور چھوٹ کر وطن آئے تو یہاں بھی نکٹے راحت کہلائے۔ یہ سب کچھ ہوا پھر بھی انھوں نے اپنی بانی نہ چھوڑی۔ دس بیس دن ذرا دم لیا کہ شیطان نے انگلی دکھائی اور ان کے دماغ میں پھوڑا اٹھا جب تک وہ پھوٹ نہیں جاتا تھا یہ چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔

تیسرا سال پورا نہیں گزرا تھا کہ ہیڈ کلرک کے بوڑھے باپ کو چاندی کی گھڑی کی خاطر گلے میں چادر ڈال کر ایسا گھونٹا کہ کئی گھنٹے تک بے ہوش رہے۔ یہ بیچارے پرانے زمانے کے پنڈت تھے۔ صبح شام سمندر کی ہوا کھانا ان کا معمول تھا۔ اس اثنا میں جو قیدی ان کو ملتا۔ ہندو یا مسلمان سکھ یا عیسائی یہ بڑی دردمندی سے اس کو سمجھاتے اور پہروں نیکی بدی کا فلسفہ بیان کرتے۔ شامت کی مار میاں راحت سے بھی مڈبھیڑ ہوگئی۔ ادھر سے نصیحت کا دفتر کھلا ادھر کتے کی سی ہڑک اٹھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پنڈت جی مہاراج کئی دن تک کھٹیا پر پڑے ہائے ہائے کرتے رہے اور جناب راحت

سنگتوں کے ساتھ کاٹھ میں ٹھونک دیے گئے۔

یہ بڑے بڑے واقعات ہیں ورنہ چھوٹے چھوٹے حادثے دن رات میں کئی کئی ہو جاتے تھے۔ آخر سزا دینے والے سزا دیتے دیتے عاجز آ گئے۔ راحت کالے پانی میں بھی اپنے اعمال کی سیاہی گھولنے سے باز نہیں آئے۔ قانون کی سزا موثر ہو یا نہ ہو۔ جیل کی سختیاں، اخلاق کی کجیوں کو سیدھا کر سکیں یا نہ کر سکیں۔ قدرت جب اپنا عمل شروع کرتی ہے تو پھر چھٹکارا نہیں ہوتا۔ اس کی سزا کا اثر جسم پر بھی ہوتا ہے اور روح پر بھی۔ چنانچہ انسان کی مجوزہ سزائیں تو میاں راحت کا کچھ نہ بگاڑ سکیں بنانے کا سوال ہی فضول ہے۔ لیکن فطرت کا کوتوال اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا تھا۔ بداعمالیاں روح اور جسم دونوں کو گھن کی طرح برابر چاٹ رہی تھیں اور راحت صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی کڑے شکنجے میں کستا چلا جا رہا ہے۔

بیس برس کی عمر ہوگی کہ راحت کو کالا پانی ہوا۔ اور کالے پانی سے آئے ہوئے صرف دس سال ہوئے تھے کہ آدھے سے زیادہ بال سفید ہو گئے بینائی میں فرق آگیا چہرے پر بڑھاپے کی جھریاں پڑ گئیں۔ تیس برس کے جوان پر اور جوان بھی حرام ڈیل۔ ساٹھ برس کے بڈھے کا شبہ ہوتا تھا یہ ہوتی ہے قدرت کی سزا جس کے بعد انسان خسر الدنیا والآخرہ ہو جاتا ہے۔ نہ بدی کی طاقت رہتی ہے نہ نیکی کا راستہ۔ قدم بند ہو جاتے ہیں۔ حواس کام نہیں کرتے۔ بس اس قابل رہ جاتا ہے کہ شیطان ٹھوکر مار کر جہنم میں جھونک دے۔

اللہ میاں کی ڈھیل ڈوری تنگ ہوتی رہی۔ راحت میاں ویسے کچلے ہوئے سانپ کی طرح جس میں جان باقی ہو، پھنا زہر سے بھرا ہوا، پھن ادھر ادھر مارتے رہے۔ وقت گزرتا رہا۔ چھوٹنے میں تیرہ مہینے باقی تھے کہ ایک قیدی نے کسی بات سے جل کر ان کی ڈاڑھی کو دیا سلائی دکھا دی۔ سارا منہ جھلس گیا۔ ہسپتال میں داخل ہوئے یوریشین ڈاکٹر تھا اس کی بیوی تھی اکثر مریضوں کو دیکھنے اور کبھی کبھی ان کو بسکٹ اور کیک وغیرہ دینے آیا کرتی تھی وہ اپنی

عادت کے موافق آئی ہر مریض کے سرہانے کھڑی ہوتی۔ مسکرا کر حال پوچھتی۔ کسی کو بسکٹوں کا پیکٹ، کسی کو سگرٹ کا ڈبہ اور کسی کو کاغذ میں لپٹا ہوا کیک دیتی۔ پھرتے پھراتے میاں راحت کے پاس بھی آئی۔ ہاتھ ملایا اور مسکرا کر کہا "او تم بڑا نٹ کھٹ ہے" یہ فقرہ ختم نہیں ہونے پاتا تھا کہ حضرت پڑے پڑے اُچھلے اور اس شریف لیڈی کے سینے پر منہ جما دیا۔ ہسپتال کے چپڑاسی اور پولس کے سنتری دوڑ پڑے۔ میم صاحب کو ڈاکٹر صاحب لے گئے اور راحت میاں آنکھیں بند کئے پڑے اپنے ہوش درست کرانے لگے۔

اس وحشیانہ حرکت کے بعد کیا ہوا اور کیوں کر ہوا اگر راحت صاحب وقت سے پہلے جہاز میں بٹھا دئے گئے۔ گویا کالے پانی نے بھی اگل دیا اور جب اپنے وطن پہنچے ہیں تو بگلے کا سا سر، جھلسا ہوا چہرہ، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ ناک پر لال رنگ کے مرہم کا پھایا، ہانپتے کانپتے کبھی اس اڈے پر کبھی اس تکیہ میں۔ بھلا کوئی کیا پہچانتا۔ نوجوان گئے تھے جھڑ دس ہو کر آئے۔ گھر در تو پہلے بھی نہ تھا اب کوئی بل بچی نہ رہا۔ اللہ اللہ پکارتے تھے اور روتے تھے۔

بڑھاپے کی رات

رات اندھیری رات۔ گھٹا کی سیاہ چادر اوڑھے۔ اس پر مکان کا یہ حال کہ چھت چھلنی۔ دیواروں کی چلیں نکلی ہوئی۔ صحن میں گھونسوں کے کئے ہوئے کھنڈرانے۔ دالان حشرات الارض سے بسا ہوا۔ چراغ میں تیل نہیں۔ تنہا کوئی آس نہ پاس۔ ایسے وقت میں خدا کے سوا کوئی چارہ ساز ہوتا ہے؟ مگر کس منہ سے اس کے کرم کی خواہش؟ موت بھی پوچھ لے تو غنیمت ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ مختاری کی نخوت کے بعد مجبوری کی ذلت میں پڑ کر ہی انسان کو اپنی بے بسی اور خدا کی بے نیازی کا احساس ہوتا ہے۔ گناہوں کے قمار خانے کا ہارا ہوا جواری راحت کالے پانی سے آیا اور جیسی صورت سے آیا دیکھنے والوں نے دیکھا۔ پوچھتا کون؟ ساری عمر ببول کے پیڑ بوئے تھے آم کہاں سے آتے۔ چاہ کندہ را چاہ در پیش۔ ہر ایک راستے میں کانٹے بچھائے

اب پھولوں کی چادر پر سونا کیسا؟۔

بچپن ٹھوکروں میں گزرا۔ جوانی بدمعاشی کے چوراہے پر چڑھ گئی۔ گناہوں نے ایسا نچوڑا کہ وقت سے پہلے بڑھاپے نے شکنیں کس لیں۔ برائیوں کی حمایتی طاقتوں نے بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ راحت کیا تھے کلفتوں کا ایک پنجر تھے کہ قبر کے گڑھے کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ کبھی جامع مسجد پر تجلی کے کھمبے سے لگے ہوئے بھیک مانگ رہے ہیں۔ کبھی کسی بھٹیارے کی دکان کے آگے بیٹھے ہوئے ہاتھ پسار رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھیک دینے والوں کی کمی نہیں۔ خیرات بھی یہاں کی ایک رسم ہے کوئی جوان کسی طرح مانگے۔ جھولی پھیلائے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ راحت بھی باوجود سینکڑوں صلواتیں سننے کے پیٹ بھر کر اور دس بارہ آنے کے ٹکے لیکر اٹھتے تھے مگر چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ بدنصیب اپنی عادتوں سے مجبور تھا جب دو چار آنے ہو جاتے لڑکتا پڑکتا سیدھا کسی جنڈو خانے یا جواری یاراں میں پہنچا۔ پرانا پاپی تھا سارے کرم کئے ہوئے تو کوئی نہ کوئی داؤں مار ہی لیتا۔ رفتہ رفتہ مرے ہوئے سانپ میں پھر سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ پانچ سات نئے بگڑے ہوؤں کو ساتھ جوئے کا ایک اڈا جما دیا اور بخشو کے تکیہ میں نال دار بن کر بیٹھ گئے۔ سماج، قانون خدائی اور خدا ایک طرف اور میاں راحت ایک طرف۔ اعضا جس قدر کمزور ہوتے جاتے تھے گناہوں کی جرات اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔ برائیوں کا کچھ ایسا چسکا پڑا تھا کہ نہ گزشتہ سے عبرت تھی نہ آئندہ کا خوف۔ گویا دنیا دار مکافات ہی نہیں۔ فطرت نے جو قانون وضع کئے ہیں ان کے آگے سر جھکانا کمزوری ہے۔ لیکن یہ جوانی جذبے ہیں اور ایک بھول ہے۔ جس کا انجام جیتے جی لعنت کا طوق اور مرنے کے بعد دائمی عذاب ہے۔

قوتوں کے ناجائز استعمال اور انسانیت کے ساتھ غداری برابر کر دوسرے آڑے پھل لا رہی تھی۔ مواخذہ جاری تھا۔ بظاہر کئے راحت صبح سے شام اور شام سے

صبح تک موج اڑاتے تھے اور بدکاریوں کی اندھیری راتیں ان کے لئے روز روشن تھیں قدرت کو اس تمسخر کا بدلہ لینا تھا اور اپنے زہر خندے سے ناگواری کا اظہار کر رہی تھی سر میں پہلے تو پھپھوندی لگی پھر گنج پیدا ہوا، ناک کا زخم بڑھتے بڑھتے "گھاؤ" بن گیا، کیڑے پڑ گئے۔ آتشک کا مادہ حلق میں پھوٹ نکلا۔ بے دانتوں کا جب منہ کھلتا تھا تو بدبو کے بھپکے کے بھپکے نکلتے تھے۔ پیٹ کو جلندر نے تنبورہ کر دیا۔ ہاتھ پاؤں چلنے کے بجائے گھسٹنے لگے یہ خدا کی اندرونی مار تھی جس نے صورت بگاڑ دی اور زندگی کے سارے طنطنے نکال دئے۔ یا تو میاں اچھے اچھے تیس مار خاں سے گالی کے بغیر بات کرنا اپنی شورہ پشتی کی ہتک سمجھتے تھے یا اب لنگڑے لولوں۔ چھوٹے چھوٹے چوتوں کی دھولیں کھانے لگے ——— !

یہ کیفیت دیکھ کر بدکاریوں کا ڈابھی ٹوٹتا چلا۔ چنڈو بندوں میں دھواں لپک اور سُلفہ چور رہ گئے۔ چکڑی پالنے والوں کی جگہ لونکرہ اور تاش کے پتوں سے کھیلنے والے دکھائی دیتے تھے۔ سفید پوشوں کی جگہ لنگوٹی بند اور برقعوں کے بدلے پھٹی ہوئی میلی چادریں رہ گئیں۔ پولس نے بھی آنکھیں پھیر لیں کبھی کبھی کوئی نشہ باز جوے کا دھنیا سپاہی آجاتا تو دھونس جما کر گانجے کی دو چلمیں پی جاتا اور اٹھنیاں بھی کھلوا لیتا راحت کیا بولتے اور بولتے تو کیا کرتے یہی غنیمت تھا کہ ان سے کوئی نہ بولتا۔ علاقہ کا ایک پرانا جمعدار دوسرے دن بلا ناغہ آیا کرتا تھا۔ وہ نشہ پانی کر کے جب جاتا تو البتہ میاں راحت کے مزاج پوچھ لیتا "کیوں بے نکٹے کیسی گزرتی ہے۔ کچھ رونق نہیں دکھائی دیتی سب وقت کی باتیں ہیں۔ تیرا زور ہی ڈھے گیا تو یہ خیا کیسے بنا رہ سکتا ہے۔ روپ کے سارے بہروپ ہیں۔ تمہاری سینہ زوریاں بھی برسوں دیکھ لیں رہے نام سائیں کا۔ اچھا جیتے رہو۔ مزے کئے جاؤ اور ہماری طرف سے خاطر جمع رکھو" جس کے جواب میں یہ بڑی حسرت سے ایک لمبا سانس لیتے اور غنغنا کر کہتے "خاں صاحب

دنیا چلتے ہاتھ پاؤں کی مایا ہے ہمارا وہ زمانہ بھی تم نے دیکھا اب یہ بھی دیکھ لو جینا کیسا ہے۔ تم نے کا ٹھکانہ بنا رکھا ہے تمہاری جوتیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ دعا کرو یہ روگ جاتے رہیں تو پھر ایک دفعہ سیر دکھا دوں"

کالی رات میں گناہوں کا لوبھی انسان جب بھٹک جاتا ہے تو دنیا کی کوئی ٹھوکر اس کو سنبھال نہیں سکتی۔ قدرت کی کسی تنبیہ کو وہ اپنے اعمال کی سزا نہیں سمجھتا۔ گر گر جب اٹھتا ہے تو بجائے شرمندہ ہونے کے اور زیادہ اکڑ کر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ راحت کی یہ تو حالت سر کچلا ہوا سانپ لنڈورا بچھو۔ خارش کتا۔ قبر کے گڑھے کا محتاج لیکن زبان میں وہی اینٹھن دل میں وہی سیاہی وہی ناپاک دھن وہی پاپ کے ارادے۔ مرنے کو پڑا ہے۔ عذاب کے فرشتے جان پر مسلط ہیں۔ ایڑیاں رگڑ رہا ہے مگر بدکاریوں سے جی نہیں بھرا۔ عبرت کا تماشا تو خود بنا ہوا ہے سیر کیا دکھائے گا؟

لیکن نہیں قدرت کو ابھی اس کا اور برا درجہ کرنا تھا۔ دنیا کے جہنم میں اس کی سزا میں کسر باقی تھی۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ کسی عورت کی میت دفن ہونے کو آئی۔ لوگ ذکر کر رہے تھے کہ بیچاری جیسی نگوڑی ماری تھی ویسے ہی کسی سے خدمت بھی نہیں لی۔ صبح کو خاصی بازار سے سودا لائی۔ دوپہر تک مرزا جی کے ہاں کھانا پکایا۔ مغرب کے وقت سنا کہ مر گئی۔ کیا ہوا کیا نہیں لیکن کہتے ہیں کہ سارا بدن پھول کر کپا ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ نہلانے والی نے لاکھ جتن کئے نہ ناک کی کیل اتری نہ ہاتھوں کی چوڑیاں اور نہ انگلیوں کی انگوٹھیاں۔ یہ بھنک راحت کے کان میں بھی پڑی منہ میں پانی بھر آیا ہونٹ چاٹنے لگے زندوں پر تو اب بس نہیں رہا تھا۔ مردوں کی تاک میں رہتے تھے پچھلے چند روز سے قبروں میں کول ڈھالی شروع کر دی تھی۔ دفنا کر لوگ چالیس قدم بھی نہ گئے ہوں گے کہ ٹیلے سے راحت نے مٹی ہٹا۔ پٹاؤ کھول مردے کو جا دبوچا۔ کفن کھسوٹا۔ انگوٹھیاں اور چوڑیاں اندھیرے میں کیا دکھائی دیتیں ٹٹولنے میں دیر لگتی۔ سیدھا سا نسخہ تھا۔ کہنیوں کے پاس سے دونوں

ہاتھ کاٹ لیے۔ اب ٹنک کی فکر ہوئی۔ منہ سوجا ہوا تھا ناک کا پتہ نہ لگا کیل روپے سوا روپے کی مالیت' جانے کیسے دیتے' روشنی لانے چلے میت کے کٹے ہوئے دونوں ہاتھ کفن میں لپیٹے بغل میں سے کہ یکایک ایک اور میت آگئی۔ راحت نے قبر دل کو لانگ پھلانگ کر نکل جانا چاہا مگر ایک تودے سے الجھ کر گر رہے۔ اتنے میں لوگ لالٹین لئے ہوئے سامنے آگئے۔ مگر نکٹے راحت کو دبکا ہوا دیکھا۔ ساتھ ہی سفید سفید کفن کی جھلکی سی نظر آئی۔ ایک نوجوان نے جھپٹ کر جو اسے اٹھایا تو اس میں سے کٹے ہوئے دو ہاتھ نکل پڑے پھر کیا تھا۔ ہزاروں مغلظات گالیاں پڑنے لگیں دو چار تو میت کے ساتھ رہے باقی نکٹے راحت پر پل پڑے۔ تھانہ میں اطلاع کی۔ پولس آگئی اور راحت میاں کو مع نامہ کفن اور کٹے ہوئے ہاتھوں کے آگے دیکھ لیا کھدی ہوئی قبر برہنہ میت اور کٹے ہوئے ہاتھ شہادت کے لئے کافی تھے اور نکٹے راحت عادی سزا یافتہ خونی مجرم دو چار ہی پیشیوں میں سات سال کو بھیج دیے گئے۔

جیل خانہ کوئی محتاج خانہ تو ہوتا نہیں۔ گورنمنٹ تو محنت لے کر روٹی دیتی ہے نکٹے راحت کس کام کے تھے۔ جیل کے لئے بھی ان کا وجود ایک عذاب تھا۔ عملہ ان کے پاس نہ پھٹکتا۔ قیدی دور رہا کرتے سوکھی روٹی کبھی ملتی کبھی نہ ملتی۔ ایک گندی کوٹھری میں سب سے الگ پڑے مکھیاں مارا کرتے۔ آخر خدا ہی کو ان کی اس مجسم لعنت زندگی پر رحم آیا اور ایک دن صبح کو عنام کی زنجیریں تڑاتے نظر آئے پاس کون جاتا۔ تعفن کے مارے کوٹھری ڈوبی ہوئی تھی۔ چند لمحوں کے بعد یہ کشمکش ختم ہوگئی مر گئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود۔ جس کم جہاں پاک زندگی کی اندھیری راتیں بجلی کی ایک چمک نے تمام کر دیں اور اب قبر کی اندھیری رات سے سابقہ پڑا۔

قبر کی اندھیری رات

زندگی کی راتیں کیسی ہی کالی اور بھیانک سہی کٹ جاتی ہیں مسجد یا خانقاہ کا راستہ نہیں سوجھتا تو تھانہ اور شراب

کی بھی تو دروازہ کھلا ملتا ہے۔ نیکیوں کا سہارا گوارا نہیں ہوتا تو بدکاریاں ہاتھ تھام لیتی ہیں۔ حلال کی روزی سے اگر پیٹ نہیں بھرتا تو حرام کے لقمے منہ چکنا کر دیتے ہیں اور کبھی کبھی آسمانِ ادبار کا کوئی نہ کوئی ستارہ ٹوٹ کر گناہوں کی فضا میں چند لمحوں کے لئے روشنی بھی پیدا کرتا رہتا ہے۔ غرض کہ عمر کی ساری منزلیں اچھی طرح یا بری طرح ختم ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ ان میں راحتیں ملیں یا زحمتیں سب عارضی ہوتی ہیں۔ اندھیرے میں اجالے کا سامان اور روشنی کو تاریکی سے بدل لینا ایک بڑی حد تک اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ دن میں سفر کرو۔ تاروں بھری رات میں راستہ چلو۔ قافلہ کے ساتھ چل کر گزارو خواہ اندھیری راتوں میں چھپتے چھپاتے ہمراہیوں سے الگ چوروں کی طرح قدم رکھو۔ لیکن یہ تمام اختیارات اسی زندگی میں حاصل ہیں۔ مرنے کے بعد اپنے بس کی کوئی بات نہیں رہتی۔ ان منزلوں سے پار ہو کر ہر انسان نیک ہو یا بد۔ امیر ہو یا فقیر۔ عبادت گزار ہو یا سیاہ کار، خدا والا ہو یا شیطان کا پرستار مجبور ہوتا ہے۔ گندم نمائی و جو فروشی کی طاقت نہیں رہتی کوئی بہانہ نہیں چلتا۔ فریب کام نہیں آتا۔ حسن عمل کی کاشت کی ہے تو خوردہ قصور سے دل بہلائیے اور اگر آدمی بوئی ہے تو بگولے کاٹئے۔ ایک دفعہ تھوڑی دیر کے لئے نہیں بلکہ دوامی یہاں کی جزا سزا دونوں لازوال ہیں۔ راحت ہے تو ہمیشہ کے لئے اور عذاب ہے تو ہمیشہ کے لئے۔ کٹنے راحت سے یہاں کی تو نیند لی۔ عزت کے ساتھ نہ سہی ذلت کے ساتھ سہی۔ خدا کا بندہ بن کر نہ سہی شیطان کا مرید بن کر سہی گر جیتے جی کی سزا میں جرم کم ہیں

عاقبت کی خبر تو خدا جانے مذہبی نقطہ نگاہ سے موت تو کنگے بھی بری ہوتی ہیں گاڑی ہوئی کوٹھڑی میں ہاتھ پاؤں میں قانونی سانپ لپٹے ہوئے تنگ کہ دم توڑا موت کی بہانہ میں نہ کوئی حلق میں شہد ٹپکانے والا تھا نہ پانی چوانے والا نہ کسی نے سرہانے بیٹھ کر کلمہ پڑھا نہ یٰسین سنائی گیا غسل اور کہاں کا کفن۔ فاتحہ اور درود تو ایک طرف جنازے کی نماز بھی نہیں ہوئی۔ کندھے دینے والوں کو ملا کرتے ہیں۔ یہاں تو زمین کا مطالبہ پورا

کرنا تھا۔ وہ جنگی گٹھڑی باندھ لے گئے اور اک سیدھا گڑھا کھود دیا۔ ایک گناہوں کی پوٹ یا ہزار
سانپ تھا جس کو کھلا نہیں رکھ سکتے تھے۔ جہنمی کا فتویٰ لگانا تو مولویوں کا کام لیکن دفن
کرنے والے جنگیوں کا بیان ہے کہ جس وقت قبر کھودی گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے
کا تنور ہے جلدی جلدی لاش کو رکھا اور مٹی ڈال   کہتے ہیں کہ اس ڈھیر میں سے
دھواں نکلنا شروع ہوا۔ دیکھتے دیکھتے شعلے سے بھڑکنے لگے۔ ہم ڈر کر بھاگے تو دور تک
مرگھٹ میں مردے جلنے کی سی بو آتی رہی اور ہائے جلا، ہائے مرا کی آوازیں سنائی دیں
اس کے بعد جب کوئی ادھر سے گزرا کبھی دھواں اٹھتے دیکھا کبھی آگ بھڑکتے ہوئے اور
وہاں ایسی سڑاند پائی کہ ٹھیرا نہ گیا برسوں ہو گئے ہیں اور اس گورِ غریباں کا وہ حصہ جہاں
راحت روحانی اذیتوں میں مبتلا ہے مردوں کے لئے بھی منحوس سمجھا جاتا ہے، وہاں
کچھ ستیاناسی کے درخت اُگ آئے ہیں۔ ایک جھنڈ آگ کے پیڑوں کا بھی ہے۔ سانپ
بچھو بھی کثرت دیکھے گئے، ایک بڑا سا بل بنا ہوا ہے کہتے ہیں کہ اس میں سیہ رہتی ہے اس
جگہ کا نام لوگوں نے دوزخ کی کھڑکی رکھ دیا ہے۔

خدا کی اصلی ناراضی یا رضامندی کی تو کسی کو کیا خبر۔ جیسا وہ قہار ہے ایسا ہی رحیم
بھی۔ ساری عمر کے گناہوں کو ایک نکتے پر بخش دے اور زندگی بھر کی عبادتیں ایک بات
میں ملیامیٹ ہو جائیں۔ جس کو دنیا راندۂ درگاہ سمجھتی ہے اس کو نوازنا اور جو ہمارے نزدیک
نوازش کے قابل ہے اسے جہنم واصل کرنا اس کا اپنا کام ہے۔ کون جانتا ہے کہ حقیقت میں
راحت کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا۔ مگر دیکھنے والوں نے تو یہ دیکھا کہ اس خدائی خوار گستاخ
بندے کا جیسا برا آغاز تھا ویسے ہی برا انجام ہوا۔ اس کی غدار جوانی اور گناہوں پر اصرار
کرنے والی طاقتوں پر جتنی بددعائیں پڑی تھیں ایک ایک کرکے سب پوری ہوئیں۔ اگر کسی
ستم رسیدہ نے کلپ کر یہ کہا تھا کہ راحت بندے تو سڑ سڑ کر مرے تو ایسا ہی ہوا۔ اگر کسی
کے دل سے یہ بددعا نکلی کہ جا نامرگ تیرے بند بند میں کیڑے پڑیں تو خدا نے قبول

سے دکھا دیا۔ مظلوموں کے کوسے کہ "خدا نے چاہا جینگ ہگ ہگ کر مرے گا" "تیری گور میں انگارے برسیں گے" اور "حرام کھانے جیسا تو نے مجھ کو موسنے پھوٹ ہی کر نکلے" ادھر ہی اودھر نہیں گئے۔ اللہ میاں کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی پاپ کی ناؤ بھر کر ڈوبتی ہے۔ بیچارے راحت کو زندگی میں اور مرنے کے بعد یہ سارے جگتان بھگتنے پڑے۔ قدرت نے اپنے ساتھ تمسخر کرنے والوں کو دکھا دیا کہ ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو — از مکافات عمل غافل مشو

غلط نہیں ہے۔

یہ عبرت کا تماشا تو دنیا کے دیکھنے والوں کے لئے تھا۔ اس کو روح کے عذاب سے کیا واسطہ؟ وہ سزائیں پوشیدہ ہیں۔ راحت نے مرتے مرتے بھی خدا کا نام نہیں لیا۔ نہ اس کا کوئی مذہب تھا نہ کوئی ایمان روزہ کیسا اور نماز کیسی۔ بندگی سے اسے ہمیشہ نفرت رہی۔ آخرت کو کچھ سمجھتا گناہوں کو گناہ جانتا تو اپنے کئے پر نادم بھی ہوتا۔ وہ تو ایک سرکش انسان تھا۔ بدیوں پر آمادہ۔ امن کا دشمن۔ خدا کا چور۔ لیکن اگر اس کی روح میں صرف اتنا ہی کھوٹ ہوتا کہ اس کی خطائیں ستار العیوب کی ذات تک محدود ہوتیں اور وہ محض اسی ایک واجب الوجود سے تمرد کا اظہار کرتا تو بھی ایک بات تھی شہنشاہ عادل کی یہ بھی ایک شان ہے کہ وہ اپنے ساتھ گستاخی کرنے والوں کو کبھی قابل مواخذہ نہیں سمجھتے بشرطیکہ انتظام مملکت میں خلل کا اندیشہ نہ ہو اور ان کی گستاخیاں متعدی صورت نہ اختیار کر لیں۔ یہاں تو غضب یہ تھا کہ راحت اگر ایک درجہ خدا کا چور تھا تو ہزار درجہ مخلوق خدا کا۔ اس نے قانون الٰہی کے توڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی ——— حقوق العباد کو اس نے بچوں کا کھیل سمجھ لیا تھا نہ ہمسایہ کی مروت تھی نہ دوست سے محبت نہ کبھی کسی ضعیفہ اور بیوہ پر ترس کھایا نہ یتیم و بیکس بچوں پر۔ نہ ان کے ہاتھوں سے کوئی نمازی پرہیزگار بچا نہ شرابی ڈھنڈاری۔ شہروں کا امن اور گھروں کا چین نہ بچا

نکٹے نے کھانا بڑوں کے لیے۔ ان کے چولہے میں گیلی سوکھی سب یکساں جلتی تھی اور یہی انکی روح کا ایسا کھوٹ تھا جس سے آسمانی حکومت کی پالیسی کبھی چشم پوشی نہیں کر سکتی تھی بہت ممکن تھا کہ خدا اپنی خطاؤں کے لیے راحت کی روح کو مبتلائے عذاب نہ کرتا۔ دنیا میں جسمانی طور پر جو سزائیں اس کو مل چکی تھیں کافی سمجھی جاتیں۔ لیکن وہاں تو سوسائٹی کے گناہ اور بندوں کی حق تلفیاں سانپ بچھو بن کر لپٹے ہوئے تھے وہ کس طرح پیچھا چھوڑتے اس وقت تک کہ میدان حشر برپا ہو۔ داور انصاف کرسی عدالت پر بیٹھے چور ڈھور سامنے آئیں۔ اعمال نامے کھلیں۔ دودھ اور پانی الگ کیا جائے۔ ایسی کھوٹی روح بھٹی میں پڑی تباہی کرتی ہے پھر بھی اگر تقدیر سے مظلوموں اور مذبوحوں نے درگزر کی تو خیر ہے زیادہ بازپرس نہیں ہوگی ورنہ دوزخ کی تیز سے تیز آنچ میں روح کو گلا گلا کر صاف کیا جائے گا۔ وہ جو کچھ ہو نیست و نابود کر دے گا۔ خدا کی خدائی میں کس کو دخل ہے۔ فی الحال نکٹے راحت مذہبی عقیدے کے مطابق تو عذاب میں مبتلا ہیں۔ بچپن کی اندھیری راتیں بے خبری میں گزریں روح کی پوری آنکھیں نہیں کھلی تھیں۔ جوانی آئی تو اندھی جس نے روح کو بھی اپنا جیسا کر لیا کالی راتوں نے بڑے بڑے طلسم بنائے اور مٹائے۔ بڑھاپے کی شب تار میں بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک بھی شروع ہو گئی اندھیرے میں رہتے رہتے روح کی آنکھیں جلتی ہیں جیسے الو کا فرموسے تو بے دین روح کہاں سے خدا سے ڈرنے والی رہتی۔ گندے مکان میں رہنے والا صاف ستھرا ہونا ممکن ہے۔ ناپاک جسم میں پاکیزہ روح کا کیا کام۔ اس سے جیسی روح ویسے فرشتے قبر میں عذاب نہ ہوتا تو کیا چوہوں کی سیج بچھتی علاوہ ازیں آج نکٹے راحت کو مرے ہوئے دس برس سے زیادہ ہو گئے ہیں لیکن کوئی بغیر برا بھلا کہے نام نہیں لیتا اور یہی اس کے مردود ہونے کی نشانی ہے۔

آغازِ شادی کا خواب

خواب کی ماہیت سے بحث نہیں، ذہن لاشعوری کا مظاہرہ کہو یا روح کے سیر سپاٹے دماغ کی بیداریاں سمجھو یا خیالات کی پریشانی۔ اخلاط کی بے اعتدالیوں کا تماشا کوئی جانے یا تنبیہ و تسکین کا الٰہی کرشمہ۔ میں فلسفی نہیں، طبیب نہیں جو اس پر گفتگو کروں، البتہ خواب دیکھنا میری نیند کا ایک خوشگوار مشغلہ ضرور ہے۔ جب سوتا ہوں ایک دوسری دنیا میرے سامنے ہوتی ہے۔ اس عالم سے بالکل علیحدہ۔ خصوصاً ان دنوں میں کہ مجھے اپنے بزرگوں کے طریقہ پر تصفیہ روح کے لیے چند منٹ کی فرصت مل جائے۔

پشتوں سے ہمارے ہاں روحانی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ ہماری ایک خانقاہ تھی حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ صاحب ارشاد سمجھے جاتے تھے۔ لیکن میرے ہاتھ سے وہ طریقہ چھوٹ گیا۔ دنیاداری کی زندگی اختیار کرلی، نہ خانقاہ رہی نہ معتقدین کے لیے مجھ میں کوئی جذب۔ ہاں اپنے طور پر تقلیداً جمعہ میں چند گھنٹے دم اللہ اللہ کرلیتا ہوں آبائی سنت کی پیروی کے سوا اور اس سے کوئی مقصد نہیں تھوڑی دیر کے لیے کروہات دنیا سے چھٹکارا مل جاتا ہے جو دم اپنے پیدا کرنے والے کی یاد میں گزر جائے غنیمت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تنہائی میں ایک خاص اہتمام کے ساتھ میرا اپنی مادی ہستی سے علیحدہ ہو کر بیس دن میں دو چار سانس لینے ہی بہت ہیں۔

میرا مناسان کرنے کا دن تو خیر جمعرات کا ہے۔ اس روز دوپہر گزار کر میں گھر سے نکل جاتا ہوں۔ میری شب کہاں گزرتی ہے! کوئی نہیں جانتا بلکہ مجھے بھی بعض اوقات اس کے سمجھنے میں تامل ہوتا ہے۔ میری اس عبادت یا خلوت نشینی کا کسی سے واسطہ نہیں۔ جاننے والے صرف اتنا جانتے ہیں کہ۔ شادی جمعرات کے دو بجے سے بعد سے جمعہ کی صبح تک گھر پر نہیں ملتا اور بس! کبھی کبھی اپنی اس عادت کے متعلق دوستوں کو چہ میگوئیاں کرتے بھی سنا ہے مگر میں نے نہ اظہار ناراضگی کیا نہ انھیں مطمئن کرنے کا خیال۔ میرا اعتقاد ہے کہ نفس کی ظلمت شہرت کی روشنی میں نہیں دور ہوا کرتی۔

چنانچہ ایک مرتبہ عین عید الفطر کے دن جمعرات تھی۔ رویت ہلال گویا میکدہ کی کھوئی ہوئی کنجی مل گئی ہے۔ تیس روزوں کے بعد کھانے پینے کی خوشی رنگ رلیوں کی حسرتیں اپنا انتشار کرتی ہیں اور کیا کہوں ہر مسلمان جانتا ہے کہ یہ کیا دلنواز دن، مرادبخش رات ہوتی ہے سراسر ہم آغوشیاں اور بے دغدغہ شادمانیاں۔ لیکن میرے لئے اس عید میں کوئی نیا پیغام نہ تھا۔ دل میں ذرہ برابر بھی پروا نہ تھی کہ خدا خدا کر کے بارہ مہینے میں عید آئی اور آج ہی گھر سے باہر جانا ہے ایک لمحہ کے لئے بھی خیال نہیں آیا کہ اللہ رسول کا حکم نہیں باقاعدہ چلہ نہیں جس کے عہدوں سے عاقبت خراب اور جس کے الٹنے کا خوف ہو۔ جانے بھی دو۔ برسوں کے بعد ایک جمعرات گئی جائے گی تو کیا ہوگا۔

میں حسب معمول صبح اٹھا غسل کیا۔ اچھے کپڑے پہنے۔ دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ عید کی نماز پڑھی۔ گھر آیا۔ احباب ملاقات کو آ رہے تھے۔ مدارات سے دم بھر کی مہلت نہ تھی۔ میرے گھر والوں کو شاید گمان نہ ہوگا کہ عید کے دن رشادی کہاں جا سکتا ہے گھر میں آئے ہوئے مہمان کی تواضع ہمارا دینی فرض ہے چہ جائیکہ مہمانوں کو چھوڑ کر میزبان کا غائب ہو جانا۔ غرضکہ سب مطمئن تھے۔ اتنے میں قریب کی مسجد میں ظہر کی اذان ہوئی۔ یہی وقت تقریباً میرے جانے کا تھا۔ میں بے تکلف اٹھا اپنے

کمرے میں گیا اور وہاں سے نکل کر سیدھا چولیا۔ میرے جانے کے بعد کیا باتیں ہوئیں، میں کیوں کر بتاتا۔ آتا واپس آ کر کان میں پڑا کہ رشادی کو دورہ آج بھی نہ پڑا۔ آدمی اپنی دھن کا اتنا تو پکا ہو۔

شہر سے دور، پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی جگہ جو انسانوں کی نظروں سے اوجھل سبزہ پریشان جہاں کا مسکن اور خوش الحان پرندوں کی شغل تھی پہنچ کر اپنے معمولات کو پورے کرنے لگا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر رات کی تاریکی میں دل روشن کرتا رہا۔ میرا دستور تھا کہ جب ذکر ختم ہوتا۔ سفیدۂ صبح نمودار ہونے تک وہیں بیٹھا رہتا یا سو رہتا۔ آج ہمیشہ کے خلاف کچھ زیادہ غنودگی سی معلوم ہوئی۔ لیٹا اور لیٹتے ہی آنکھیں بند تھیں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے قریب ایک بلند چٹان پر بغدادی چرواہوں کا سا لباس پہنے ایک شخص بیٹھا ہے۔ بانسری ہونٹوں سے لگی ہوئی اور فضا خاموش۔ یکایک چاروں طرف سے نغموں کے آبشار ابلنے لگے، وادیاں گونج اٹھیں، درختوں کا پتہ پتہ تال دے رہا تھا۔ سروں میں کچھ ایسی شیرینی اور ہم آہنگی تھی کہ روم کے دلق پوش مولوی کی نے نواز حکایت و شکایت یاد آ گئی۔ سمجھا کہ یہ باغ فردوس کو کوئی رمنا ہے اور بانسری سے نکلنے والی آوازیں راز الٰہی کے نغمے، جو اس میں داخل ہونے والوں کو مادی دنیا کی کلفتیں کو جلانے اور یہاں کے سرمدی لطف کو بڑھانے کے لئے سنائے جا رہے ہیں۔ شاید مومن کے لئے یاد الٰہی میں محو رہنے کا یہی شغل ہے۔

میری کیفیت نیم بیداری کی سی تھی، ایسا خواب تھا جو عالم تصور میں دیکھا جاتا ہے۔ یعنی اس میں کچھ حقیقت کے جلوے بھی تھے۔ کیونکہ یہ چٹان ایک پر اسرار چٹان مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ وہاں کسی جن کا گزر ہے، نوا ساز۔۔۔ تو آج تک دکھائی نہیں دیا، مگر موسیقی کی آوازیں اکثر سنی ہیں۔ دہشت انگیز خیال حالت خواب میں زیادہ دہشت ناک ہوتا ہے۔ میرے جسم میں روح سے کروٹیں لینی شروع کیں۔ اس نے

بانسری بجاتے بجاتے میرے دلی خطرات کا جائزہ لیا اور جیب میں سے چور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

بے نواز کی آنکھوں میں موسیقی کی تانیں جھنک رہی تھیں۔ ان میں عجیب قسم کا جذب تھا۔ میں مدہوشانہ اس کی طرف کھنچا اور اس کے پاس پہنچتے ہی قدموں پہ گر پڑا۔ رقت طاری ہو گئی۔ آنسوؤں کی لڑیاں راگ مالا بن کر اس ترنم کے دیوتا کے چرن چھونے لگیں۔ چند لمحہ تک وہ مجھے دیکھتا رہا۔ پھر میرے سر پہ ہاتھ رکھا۔ اٹھنے کا اشارہ کیا۔ مسکرایا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرے قلبی تاثرات کو سمویا جب میرا خوف اطمینان سے بدل گیا اور وحشت جاتی رہی تو مجھے خطاب کر کے بولا۔

بے نواز:۔ آغا رشادی! دنیا خطرات اور وسوسوں کی منڈی ہے۔ اصلی راحت، حقیقی اطمینان اور روحانی مسرتیں یہاں نہیں جس قدر لین دین ہوتا ہے۔ بے اعتباریوں کا۔ نہ خوشی کی کوئی حقیقت ہے۔ نہ غم کی اصلیت، نہ موت موت ہے نہ زندگی زندگی۔ ایسے بے اعتبار جذبات اور ایسی خیالی چیزوں سے روح کو آلودہ نہ کیجئے

میں:۔ یا شیخ! بزرگوں سے سنا تو یہی ہے، لیکن کیا یہ عالم موجودات محض ایک تماشا ہے، بے نتیجہ، فضول؟

بے نواز:۔ تماشا، واقعی تماشا! مگر کیا تماشا؟ بائسکوپ کی تصویریں دیکھی ہیں؟

میں:۔ اکثر۔

بے نواز:۔ کیا سمجھے۔

میں:۔ کچھ نہیں!

بے نواز:۔ متحرک اور ناطق عکس ہوتے ہیں۔

میں:۔ جی ہاں یہی معلوم ہوتا ہے۔ اچھا تو یہ دنیا بھی ایک چلتی پھرتی بولتی چالتی تصویر ہے؟

بے نواز:۔ خود یہ نہیں بلکہ سینما ہال۔

میں :- پھر تو سطح زمین پر وہ بھی یہیں ٹھہرا۔

بے نواز :- بے شک۔

میں :- اور یہ تصویریں بنتی اور چلتی کہاں ہیں؟

بے نواز :- مصور حقیقی کے علم میں، قانون قدرت کی حدود کے اندر!

میں :- اچھا دیکھنے والے کون ہیں؟

بے نواز :- (مسکرا کر) اعضا کی فلم سازی میں یہی کمال ہے کہ جو تماشا ہیں وہی تماشائی

میں :- سبحان اللہ! لیکن یہ روح و جسم؟

بے نواز :- یعنی؟

میں :- یعنی روح اور جسم کا مصداق کیا ہے؟

بے نواز :- تماشا ساز کا ارادہ اور حکم کُن فیکون! امر روح ہے ظہور جسم۔

میں :- تو یہ مادی اور روحانی کیفیتیں بے معنی ٹھہریں؟

بے نواز :- محض اعتباری اور اصلاحی!

میں :- پھر گناہ و ثواب کیا ہے؟

بے نواز :- تصویر کی خوش رنگیاں یا بد رنگیاں!

میں :- (بے نواز بزرگ کا حیرت سے منہ دیکھ کر) اس طرح تو آپ نے زندگی کا سارا طلسم ہی توڑ دیا۔

بے نواز :- (ہنس کر) آخر تم زندگی کے کیا معنی سمجھتے ہو؟

میں :- جو اوروں نے آج تک سمجھے ہیں!

بے نواز :- خیال اور اعمال کی یہی ہم رنگیاں تو اس بات کی دلیل ہیں کہ دنیا اصل شے نہیں، پرچھائیں ہے۔

میں :- تو جناب کے نزدیک زندگی عطیہ الٰہی نہیں؟

بے نواز :۔ روح اور مادہ کی الجھنوں کے گرفتار بندے! کائنات کا ایک ہی رخ دیکھا کر
زیادہ جھگڑوں میں مبتلا نہ ہو۔

میں :۔ (تعجب سے) اس تصویر کا کیا دوسرا رخ بھی ہے ؟

بے نواز :۔ قدرت کا شاہکار اور ایک رخا ؟

میں :۔ کیا وہ دوسرا رخ بھی کوئی دیکھ سکتا ہے ؟

بے نواز :۔ کیوں نہیں ؟ دیکھنے والا ہونا چاہیئے یا دکھانے والا !

میں :۔ میں دیکھ سکتا ہوں ؟

بے نواز :۔ (مسکرا کر) تمہاری بصارت میں تو کمی نہیں، چشم عنایت درکار ہے !

میں :۔ آپ مہربانی فرمائیں۔

بے نواز :۔ ایک جھلک ہوگی، دھندلا سا خاکہ، زیادہ پاؤں تو نہیں پھیلاؤ گے؟ بولو
منظور ہے ؟

میں :۔ منظور ہے !

بے نواز :۔ اچھا آؤ، کیا یاد کرو گے، ذرا سامنے مشرق کی جانب نظر دوڑاؤ۔۔۔۔۔
کیا دکھائی دیا ؟ میں نے پہلے تو سرسری نگاہ ڈالی، منظر نیا تھا اس لئے پھر ذرا غور سے
دیکھنا شروع کیا۔

بے نواز :۔ کچھ دیکھا ؟

میں :۔ حضرت! ایک بڑی، بہت بڑی، نگاہوں کی حد سے باہر تک وادی ہے جس
کے درمیان سے پانی نہایت موٹی دھار میں غراتا اور شور مچاتا ریل گاڑی کی طرح گزرتا ہے۔

بے نواز :۔ اے معیتوں کی گمائی کمتے میں ہستی کے طوفان کی ایک موج نے یہ شور
مچا رکھا ہے۔

میں :۔ اور اس موج کی ابتدا اور انتہا دونوں تاریکی میں کیوں غائب ہیں ؟

بے نواز :۔ موجود کے سوا اور سب فانی اور باقی پر پردہ ہی پڑا رہنے دے۔ ازل اور ابد کی جستجو تیرے بس کی نہیں۔ ماضی و مستقبال سے تجھے کیا بحث۔ حال کو دیکھ، جو تیری آنکھوں کے سامنے سورج ناپ رہا ہے۔

میں :۔ کیا عالم حقیقت میں بھی زمانے ہیں؟

بے نواز :۔ نہیں! وہاں نہ ماضی ہے نہ حال جو کچھ ہے استقبال۔

میں :۔ تعجب ہے اصل اور نقل میں اتنا فرق؟

بے نواز :۔ تعجب کیا؟ حال اور ماضی بے وجود ہیں۔ گزشتہ معدوم، حال موہوم، اسے پل بھر بھی قیام نہیں، باقی مستقبل ہی متنفس رہا جس میں تمثیلات کی جانچ پڑتال ہو گی۔

میں :۔ آپ نے ابھی فرمایا تھا، حال کو دیکھ! کیا دیکھوں؟

بے نواز :۔ نادان! یہ مثالی عالم ہے۔ یہاں حال ہی پر استقبال منحصر ہے۔

میں :۔ (پریشان ہو کر) یہ زمانوں کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

بے نواز :۔ خیر زمانوں کے چکر میں پڑنا تمہارا کام بھی نہیں۔ کہو اس وادی کے اوپر جہاں تہ رنگی چھائی ہوئی ہے کیا دکھائی دیتا ہے؟

میں :۔ (بڑے غور سے دیکھ کر) ایک پل ہے، عجیب و غریب ہچکولے کھاتا ہوا۔

بے نواز :۔ یہ پل حیات انسانی ہے۔

میں :۔ اُفوہ! اس میں تو محرابیں ہی محرابیں ہیں۔ دو۔ چار۔ آٹھ۔ دس۔ بیس۔ تیس۔ چالیس۔ پچاس۔ ساٹھ۔ ستر۔ ہاں کوئی اَسّی ہو گی۔ کچھ ٹوٹی ہوئی ہیں۔ سب کو گنوں تو ضرور سو تک پہنچ جائیں۔ پانی کا بڑھتا ہوا ندی اور طوفان موجیں برابر ٹکریں مار کر ان میں رخنے ڈالتی چلی جا رہی ہیں کسی دن یہ پل یوں ہی آ رہے گا۔

بے نواز :۔ تمثیل کا سلسلہ ختم ہونے تک تو لاکھ تلاطم ہوں، طوفان کیسا ہی تہ و بالا کیسے پل اپنی جگہ سے ہٹتا نہیں۔ ہاں محرابیں ضرور گرتی جاتی ہیں۔

میں :- اس کی مرمت کیوں نہیں کی جاتی ؟

بے نواز :- تماشے کی آخر کوئی انتہا بھی ہونی چاہیے۔ مذہبی تاریخ سے بھی سات ہزار سال ہوئے کہ اس کی بنیاد پڑی تھی۔

میں :- مذہبی تاریخ کے علاوہ بھی کوئی مواد ایسا ہے جو اس کی تعمیر کا پتہ دے ؟

بے نواز :- علم الحیات والے تو اس کی عمر لاکھوں برس کی بتاتے ہیں!

میں :- اعتبار کس کا کیا جائے ؟

بے نواز :- اعتبار : قیاس کو اعتبار کا درجہ دینا۔ مشاہدات کے منافی ہے۔ میں کہتا ہوں ماضی، ماضی ہو چکا، حال درست کر دیا استقبال کو سوچو اور بس! ہاں اور کیا نظر آتا ہے ؟

میں :- انگنت آدمی اس پر سے گزر رہے ہیں، ہر ایک کی چال الگ ہے۔ کوئی تیز قدم اٹھائے کوئی لڑکھڑاتا ہوا منہ لٹکائے۔ اف! کیسا خوفناک نظارہ ہے! ایک نہ دو سینکڑوں خود بخود پل کے نیچے گرے چلے جا رہے ہیں، ذرا قدم بہکا اور پانی میں موجیں بے تکلف انسانوں کو نگل رہی ہیں۔ ہائیں یہ کیا۔ پل ہے کہ موت کی گھاٹی جا بجا کھندے کھلے ہوئے ہیں۔ قدم قدم پر آنکھوں سے اوجھل نیچے کھلتا ہوا دروازہ ہے کھنداؤں سے کوئی بچ بھی گیا تو دروازہ پر پاؤں پڑا اور چلا تحت الثریٰ کو۔

بے نواز :- بس ؟

میں :- مرشدی! بس یہ کیسی! انبوہ در انبوہ ایسی خلقت بھی ہے جو تھکی ہوئی چال اور افسردہ احوال سے ٹوٹی ہوئی محرابوں پر اس طرح چل رہی ہے جیسے اودان پر طوطا۔ بیچارے بالکل سفر سے خستہ اور دل برداشتہ معلوم ہوتے ہیں جسم ہارے ہوئے منزل کٹھن، اس پر طرہ۔ بھیڑ، تو مجھ پر اور میں تجھ پر لڑکھڑا لڑکھڑا کر گرے پڑتے ہیں

بے نواز :- جوانی لٹ کر بڑھاپے کے ہارے دل کا یہی حشر ہوتا ہے۔

میں :۔ افسوس، آخر انھیں اس حالت میں سفر کی کیا ضرورت؟

بے نواز :۔ تماشا گر کی مرضی!

میں :۔ آخر؟

بے نواز :۔ آخر کیا! یہ تماشے کے قابل نہیں رہے۔ ناکارہ ہو گئے۔ اب ان کو نئے دم والوں کے لئے جگہ خالی کرنی چاہیئے۔ جن سے تماشے میں کچھ لذت پڑے۔ وہ اسٹیج کا کوڑا سمجھے جاتے ہیں۔

میں :۔ مگر اتنی بے دردی سے انھیں نکالا جا رہا ہے گویا ان کا وجود کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔

بے نواز :۔ (قہقہہ لگا کر) اہمیت! ناقص العقل انسان! تو کیا جانے کہ بازیگر اپنے تھیلے میں کیا ڈالتا ہے اور کیا نکالتا ہے۔ اس کے کھیل وہی جانے۔ تو اپنی سیر کیے جا کوئی کرتا ہے، اچھا بتا اور کیا دیکھا۔

میں :۔ حضرت! وہ!! ان تھکے ماندوں کو جانے دیجئے۔ شکستہ محرابوں پر راستہ ٹٹولنے والے تو متروک الدنیا ہی سہی۔ انھیں کیا کہئے گا؟

بے نواز :۔ کن کو؟

میں :۔ جی یہ جو بعض ہٹے کٹے ہشاش بشاش! بالکل چاق و چوبند مضبوط۔ بے فکر جنھیں کوئی بھی از کار رفتہ نہیں کہہ سکتا۔ کیوں اس طرح آنکھیں بند کئے اور منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ اپنے جیسوں ساتھیوں کو گرتے اور مرتے دیکھتے ہیں۔ صریحاً دیکھ رہے ہیں کہ سنبھلنے کی جگہ نہیں۔ ہاتھ پاؤں مارنا بے سود ہے۔ تنکا تک سہارے کو نہیں ملتا۔ مگر کیا مجال ہے کہ پلٹنے کا نام لیں۔ ان پر آخر کیا پھٹکار پڑی ہے۔

بے نواز :۔ یہ حرام ذلیل، ناشکرے اور اپنی قوتوں کو قانون کے خلاف استعمال کرنے والے ہیں۔ قدرت کی مہربانیوں نے انھیں باغی بنا دیا۔ سوانگ میں ان کی عزت

پڑھائی۔ بڑے درجے دیئے، بجائے شکر گزار ہونے کے یہ اکڑ گئے، سمجھ بیٹھے کہ ہم بھی کارسازی کی کارسازی میں شریک ہیں۔ مالک والا مجبور ہے کہ ہماری خاطر کرے ہم نہ ہوں گے تو اس کا سارا کھیل ہی ختم ہو جائے گا یہ نہ جانا کہ جب وہ چاہتا ہے بادشاہ کو گدا سے، ساہوکار کو چور سے، اعلیٰ کو ادنیٰ سے پارٹ ادا کرا دیتا ہے۔

میں :۔ اچھا تو یہ گمراہ اور احسان فراموشی کے مارے ہیں۔

بے نواز :۔ ہاں، حاکم حقیقی ظالم نہیں وہ سنبھلنے اور راہ راست پر آنے کی پہلے تو مہلت دیتا ہے، چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ کبھی خبردار ہوشیار کرتا ہے کبھی اور نوازتا ہے کہ بندہ نوازی کی ساری حجتیں پوری ہو جائیں۔ جب غدار بندہ کسی طرح باز نہیں آتا بلکہ بگڑتا چلا جاتا ہے تو آخر وہ مالک شہنشاہ نخرے کب تک اٹھائے، لات مار کر نکال دیتا ہے۔ پھر اس کے ٹھکرائے ہوئے کو کون پناہ دے۔

میں :۔ میرا تو کلیجہ کانپنے لگا۔ یا اللہ! یہ سین سب سے بڑھ کر حسرت ناک ہے دیدۂ ذلیل اللہ اللہ کرنے والوں کی ٹولیاں بڑی شان سے چلے ادھر آتے آتے یکایک رکتی ہیں۔ ان کے چہروں کا نور اڑنا شروع ہوتا ہے، پاؤں زمین سے لگنے لگتے ہیں۔ کوئی تو ایک جھرجھری لے کر چلانگ مار اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے اور کسی کے پاؤں ایسے پھسلتے ہیں کہ ان کے ڈوبنے کی آواز تک نہیں آتی۔

بے نواز :۔ واقعی یہ بڑی عبرت کا مقام ہے۔ اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔

میں :۔ یہ کون لوگ ہیں؟

بے نواز :۔ آغا رشادی! اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم آہ۔ یہ وہ بدنصیب مولوی صوفی اور ذاکر و شاغل ہستیاں ہیں جو عمر بھر قال اللہ و قال الرسول کرتے رہے نفس کے سارے لذائذ خدا کی راہ میں قربان کر دیئے۔ لیکن یک بیک اپنی نیکیوں اپنی ریاضتوں اور اپنے حسن عمل کا غرور کر گیا۔ گمان ہونے لگے کہ ہم جنت کے مالک جنت

والے کے حارث، خدائی ہمارے ہی دم سے تو قائم ہے۔ کبر و غرور سے بڑھ کر اس کی جناب میں کوئی گستاخی نہیں۔ "ہم اور میں" سے اسے انتہائی نفرت۔ تیور بدل گئے آنکھیں پھر گئیں۔ مدتوں کی عبادت پل کے پل میں لعنت کا طوق بن گئی۔ پارہ ہونے کو تھے کہ طوفان نے لپک لیا۔

میں :۔ سچ ہے وہ نکتہ نواز بھی ہے اور نکتہ چیں بھی۔۔۔۔۔ جناب یہ رنگ برنگ کے ہنگامے کیسے؟ تماشا ہے کہ چوں چوں کا مربہ کسی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہیں اور ہاتھ دعا میں مصروف۔ کوئی بیڑیاں پہنے جھیک کہتا چلا جا رہا ہے پلٹنوں کی پلٹنیں تلواریں سونتے ہوئے لڑتی چلی جاتی ہیں۔ طرح طرح کی مخلوق ہے کہ فوج در فوج چلی آتی ہے۔ جال والے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خانقاہیں رواں ہیں۔ قال والے ہیں تو گویا مدرسہ نکل آیا ہے۔ غرضکہ مختلف زندگیوں کی بلی جلی ایک رو ہے جو ایک دوسرے سے بے خبر صرف اپنی دھن میں ابلی چلی آتی ہے اور کوئی کہیں کوئی کہیں، کوئی اندھیرے سے روشنی میں آتے ہی کوئی روشنی کو طے کرتے کرتے، خاموش بلا ہاتھ پیر مارے یا چیختا چلاتا کشمکش کرنے کے بعد موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ وہ بڑے خوش نصیب ہیں جن کو پل راستہ دے دیتا ہے اور گرتے پڑتے یا ہنستے کھیلتے پار اتر جاتے ہیں۔

سے نوازہ :۔ بس بس اب پل کی سڑک سے نظر ہٹا لو۔ ورنہ جو منظر ابھی باقی ہے اسے بھی دیکھ لیا تو مجھے خوف ہے کہ کہیں تمہاری حالت نہ بگڑ جائے۔ دلی کیفیت اگر بگڑ گئی تو دنیا سے متنفر ہو جاؤ گے اور دنیا سے اس صورت میں متنفر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ تم اللہ کے نافرمان بردار بندے ہو۔ اب اوپر کی طرف دیکھو۔

میں نے آنکھیں ذرا سی ذرا بند کر کے اوپر نگاہ کی، بالکل نیا سماں تھا۔ عجیب الخلقت پرندے۔ بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے ایک رنگ چتکبرے، ہزارہا، لکھوکھا کی تعداد

میں منڈلا رہے ہیں۔ کسی کا دھڑ چیل کا، اور صورت انسان کی، کسی کی شکل گدھ کی سی اور سارا آدمی۔ کوئی پردار سانپ ہے تو کوئی سور کی تھوتھنی کا بگلہ۔ ایک سے ایک نرالی اور ڈراؤنی وضع کا۔ کچھ چھوٹے چھوٹے خوب صورت بچے ہیں رنگ دھڑنگ حسین مگر آنکھوں سے اندھے، تیروں سے بھرے ترکش کندھوں پر کمان ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے نازک پروں سے نہایت تیزی کے ساتھ چکر لگاتے اور تیروں کی بوچھاڑ کرتے جاتے ہیں۔ نیچے چلنے پھرنے والی مخلوق بے پناہ ہے۔ برابر زخمی ہو رہی ہیں۔ آہ و بکا کا ایسا شور ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی ــــ اسی کے ساتھ دو پرندے بھی بالکل بے آزار نہیں۔ کسی کے پروں سے آگ کے شعلے، کسی کے چونچ سے زہر کی بوندیں کسی کے پنجوں سے جادو کی کنکریاں برس رہی ہیں۔

میں :۔ بزرگوار! یہ کیسی قیامت ہے! میرا تو دل گھبرانے لگا۔ للہ اس قصہ کو حل کیجئے!

بے نواز :۔ نہیں سمجھے! دنیا میں رہ کر ان بلاؤں سے بھی واقف نہیں۔

میں :۔ کبھی دیکھا ہو تو سمجھوں۔

بے نواز :۔ روز دیکھتے ہو۔ دن میں بار ہا ان سے سابقہ پڑتا ہے اور نہیں جانتے افسوس، انسان کتنے اندھیروں میں مبتلا ہے۔

میں :۔ جناب! . . . . . .

بے نواز :۔ جناب کیا، میاں یہ وہی انسانی جذبات ہیں جن کا نام حسد، رشک، لالچ محبت، نفرت، دوستی، دشمنی، غصہ، منافقت، امید اور خود فریبی وغیرہ ہے، جو انسان کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور جنھوں نے اندر و باہر چار جانب سے زندگی کو مبتلائے آلام بنا رکھا ہے۔

میں :۔ اللہ میاں بھی خوب ہیں، اتنی سی جان کے ساتھ اس غضب کی ستم ظریفی۔

بے نواز :۔ اشرف المخلوقات صفت میں بننا چاہتے ہو۔ حاکم مجازی کا منظور نظر

بننے کے لئے کتنے امتحانوں اور کسی قدر آزمائشوں میں پورا اترنا پڑتا ہے۔ خدا کی قربت اور فطرت کی درستی کو کیا، سب نے بھی آسان سمجھ لیا ہے۔

میں:۔ تو کیا انھیں راہ آزمائش کی غرض کہیں سمجھا جائے۔

سے نواز:۔ یقیناً۔ ان سے بچتے ہوئے گزرنا ہی نجات ہے۔

میں:۔ واہ جناب واہ! ابھی زندگی عطا ہوئی ہے۔ تکلیفیں مصیبتیں پریشانیاں اور آخر میں موت کا انتظار۔ پھر انتشار کی حد! پل سے گر کر طوفان کا لقمہ بنو یا اندھیرے میں کھو جاؤ۔ عذاب حاضر اور نجات غائب!

سے نواز:۔ (منہ بنا کر) زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا مگر اس طرح کیوں نہ جیو جیسے مردان خدا جیتے ہیں۔

میں:۔ ان کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟

سے نواز:۔ مرنجان و مرنج سب تیرہ و بابہ۔ ان کی زندگی موت اور موت زندگی ہے اور دنیا کی جب آنکھیں بند ہوتی ہیں ان کی کھلتی ہیں وہ زندگی کو خواب اور مرگ کو بیداری جانتے ہیں۔

میں:۔ پیر و مرشد! اس درجے پر ہر بشر کب پہنچ سکتا ہے۔

سے نواز:۔ میرا تو یہ عقیدہ نہیں ...... لیکن تم کچھ گھبرا سے گئے ہو۔ تھوڑی سی تفریح بھی ہونی چاہیئے۔ پل کے نیچے دیکھنا ہاؤ کی جانب نگاہ ڈالتے چلے جاؤ۔ کیا دکھائی دیتا ہے؟

میں:۔ بل کھاتی ہوئی وادی اور پانی کی موجوں کے سوا جس میں حوا کی گود کے پالے اترتے چلے جاتے ہیں اور جو خدا جانے آدم کی کتنی نسلوں کو ہڑپ کر چکی ہے۔ میں تو کچھ دیکھ نہیں سکتا۔

سے نواز:۔ کچھ نہیں! اوپر کہر اور نیچے اندھیرا گھپ۔

میں :- جی ہاں ۔ دور تک !

مے نواز :- میرے تصور سے کام لو ۔ شیخ کے تصرفات ایسے ہی اندھے وقتوں کے لئے ہوتے ہیں ۔

میں :- اخاہ ! سیاہی چھٹنے لگی وادی کا طول اللہ کی پناہ ! آگے بہت آگے جا کر یہ تو کچھ سے کچھ ہو گئی کشادہ ہوتے ہوتے دریائے بے کنار نظر آنے لگی ۔ یہاں تک کہ اس کا پھیلاؤ ایک ایسے سمندر سے جا ملا ہے جس کے بیچ میں ہزاروں جزیرے ہیں لیکن یہ کیا نصف روشن اور نصف تاریک ۔ مشرقی حصے کو کالے کالے بادلوں نے گھیر رکھا ہے دھوئیں کے مارے آنکھ کام نہیں کرتی ۔ شاید آتش فشاں پہاڑ یا سرنگ دھوئیں دیتے پھٹ پڑیں گی ۔ البتہ آدھا حصہ جس پر روشنی کی چادر پھیلی ہوئی ہے ، اس کی نضارت کا کیا کہنا ۔ سبحان اللہ ! میدان ہیں یا چٹانیں سب سرسبز و شاداب صاف شفاف پانی کے چشمے جاری ۔ گویا ایک باغ ہے عالمگیر ، ہرے بھرے چمنوں سے آراستہ رنگ برنگ کے پھول پھلوں سے بھرا ہوا ۔ ہا ہا یہاں کے باشندوں کی وضع قطع شکل صورت بھی دنیا سے نرالی ہے ۔ اجلے چمکیلے سفید براق کپڑے چہروں پر مسکراہٹ آوازیں جیسے چاندی کی گھنٹیاں بج رہی ہوں ۔ کیسے خوش خوش فواروں کے گرد حوضوں کے کنارے اور درختوں کے کنج میں بیٹھے چہلیں کر رہے ہیں یا رنگ برنگ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ادھر ادھر سے ادھر سیر گشت میں مصروف ہیں بے فکری آزادی اور زندہ دلی سے لبریز نہ حسرتیں ہیں نہ ارمان نغموں کی صدائیں ، پرندوں کی چہچہے اللہ اللہ کیا عالم ہے ۔

مے نواز :- یہ مقام تمہیں پسند آیا ۔

میں :- کیسا کچھ ۔ جی چاہتا ہے کہ پر لگ جائیں ، ہوا اڑ کر جا پہنچوں ۔

مے نواز :- اتنی بے تابی ! اڑ کر جانا چاہتے ہو ؟

میں :- کیوں! ہوائی جہاز مل جائے تو دمنٹ کو بھی راستہ نہیں!

لے نواز :- (مسکراتے ہوئے) بجا ہے، چند لمحے کے لئے آپ کی آنکھوں پرسے غفلت کا پردہ جو اٹھ گیا آپ عمروں کی مسافت کو ہوائی جہاز کی ایک اڑان سمجھ بیٹھے اور عمروں میں بھی، وہ خوش نصیب پہنچ سکتا ہے جس کو خدا چاہے۔

میں :- کیا اس کا راستہ پیچیدہ اور کٹھن ہے۔

لے نواز :- کٹھن بھی اور آسان بھی، پیچیدہ بھی اور سیدھا بھی۔

میں :- آپ عجیب بات فرما رہے ہیں؟

لے نواز :- عجیب تو نہیں!

میں :- آخر اس میں داخل ہونے کے لئے کوئی راستہ تو ضرور ہوگا؟

لے نواز :- ہوگا کیا معنی ہے! بلکہ تم ابھی دیکھ چکے ہو!

میں :- میں نے کوئی ایسا راستہ نہیں دیکھا۔

لے نواز :- وہ پل کیا تھا؟

میں :- (تعجب سے) وہ ٹوٹا پھوٹا، طوفان زدہ، مصیبت ناک پل!

لے نواز :- ہاں، وہی اور صرف وہی اس باغ کا راستہ ہے۔ اس کو پھلانگے بغیر کوئی انسان نہ ہوا میں اڑ کر نہ پانی میں غوطہ لگا کر وہاں نہیں پہنچ سکتا۔

میں :- اچھا تو یہ جنت تھی!

لے نواز :- اب سمجھ گئے ہو گے کہ جنت میں داخل ہونا موت کا مرحلہ طے کرنے سے پہلے ناممکن ہے۔

میں :- مگر پل پر سے سلامت گزر جانا بھی تو آسان نہیں!

لے نواز :- ایمان مضبوط، دل پاک، دنیا کی آلودگی سے جسم ہلکا ہے، روح بوجھل اور پاؤں میں لغزش نہیں، تو آنکھ جھپکتے ادھر سے ادھر۔ بہتوں کو دیکھا ہوگا کس طرح

گمن اور اچھلتے کودتے چلے جاتے تھے۔

میں: ان کا بھی تو ذکر کیجیے جو پل کو پار نہیں کر سکے۔ رستہ ہی میں رہ گئے رہنا کیسا پانی میں قبریں بن گئیں۔

لے نواز: اس پل کے نیچے قبروں کا کیا کام؟

میں: پھر؟

لے نواز: وہ دوسرے رستے لگ گئے۔

میں: پانی میں سے بھی کوئی راستہ ہے؟

لے نواز: ہاں۔ موجیں انھیں بھی کہیں نہ کہیں تو پہنچا ہی دیتی ہیں۔

میں: آخر کہاں؟

لے نواز: سمندر کے اس تاریک حصے میں جو عذابوں کی کدر فضا سے ڈھکا ہوا تم نے دیکھا ہے۔

میں: جہنم کیوں نہیں کہتے؟

لے نواز: چپ! دوزخ کا نام لیتے ڈر نہیں لگتا۔

میں: (خوف زدہ ہو کر) ڈر کی کیا بات ہے مکان اس کا مکیں اس کے بنائے وہ جہاں چاہے

لے نواز: ظاہر جگہ اسی کا ظہور ہے۔ کہیں نہر کہیں قہر مگر گنہگار بن کر کوئی مقہور کیوں ہو۔ انسان کا فرض ہے کہ اطاعت کرے اور راضی برضا رہے۔

میں: اچھا اگر یہی جنت ہے تو حور و قصور تو کہیں نظر آئے نہیں۔

لے نواز: جنت کا پورا نقشہ یہ ماری آنکھیں کب دیکھ سکتی ہیں۔ یہ تو ایک دھندلا سا خاکہ تھا۔ وہاں کا اصلی حسن اور ساز و سامان کی جھلک بھی انسانی تخیل میں نہیں آسکتی

میں: جنت کے بھی سنا ہے مختلف مدارج ہیں۔

لے نواز: جیسا کام ویسا ہی انعام جیسی خدمت ویسی عظمت۔ یہیں دیکھ لو کہ ست

کے متوسلوں میں کوئی چپڑاسی ہے تو کوئی دفتری۔ کوئی مصاحب ہے تو کوئی درباری سب کا درجہ الگ اور سب کے اعزاز جدا۔ اسی طرح وہاں کا کاروبار بھی سمجھو۔ جس قسم کی یہاں عبادتیں، ریاضتیں، نیکیاں اور قربانیاں کرو گے اسی شان کا وہاں مقام ملے گا۔

میں:۔ تو گویا کئے کو پھل ملے گا؟ یعنی وہاں کے لئے یہیں تیاری کرنی پڑتی ہے۔

نے نواز:۔ بے شک، دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے اسے نیک اعمال سے سینچو گے۔ گناہوں کی آندھیوں، بے اعتدالیوں کے جاڑے پالے سے اس کی حفاظت کرو گے عاقبت میں پھل لائے گی۔

میں:۔ پھر تو انسان بڑا غلط کار اور بودا ہے اور ظلم کرنے والا ہے۔ غفلت میں پڑ کر اپنی آنکھیں خراب کر لیتا ہے اور جب ببول کے درخت اگ آتے ہیں تو پریشان ہوتا ہے۔

نے نواز:۔ آپ ہی دیکھئے، کھوٹے سکے کون لے۔ کانٹوں میں آم کہاں۔ باغی کو بھی کہیں عزت ملی ہے۔

میں:۔ یہ سب درست لیکن دنیا کی بہار کو خزاں سمجھ لینا بھی تو کار سے دارد۔ یہاں کی لذتوں سے بھی تو منہ نہیں موڑا جاتا۔ اور اللہ کا پیارا تو وہ بنے جو آل اولاد عیش و عشرت، حسن و دولت سب پر لات مار کر جنگل میں جا بسے۔

نے نواز:۔ اول تو یہ نظریہ ہی غلط ہے۔ خدا پرستی کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کو چھوڑ دے دنیا کی نعمتوں سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ اصل بندگی یہ ہے کہ دنیا والوں میں رہے مگر خدا کو یاد رکھے دوسرے یہاں کی چند روزہ تن آسانیوں کے مقابلے میں وہاں کے دائمی عذاب کو اختیار کرنا یا ان فانی اور خیالی تکلیفوں اور مصیبتوں کی وجہ سے پائدار سے بے نیاز ہو کر جنت کو ڈھکوسلا کہنا کتنی حماقت اور کس درجہ

کی بے عقلی ہے۔

میں:۔ واقعی وہ انسان، انسان کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں جو اپنی اچھائی برائی کو نہ سمجھے۔

لے نواز:۔ نہ سمجھیں کیا! بہت سے بدبخت نہیں سمجھتے اور آخر کیفر کردار کو پہنچتے ہیں۔ بدی کا فرشتہ انھیں پل پر سے دھکیل دیتا ہے۔

میں:۔ اور وہ غوطے کھاتے ڈوبتے اچھلتے قید خانہ پہنچ جاتے ہیں۔

لے نواز:۔ یہ قید خانہ کیسا؟

میں:۔ جناب وہی جگہ جو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہے۔ نام لوں گا تو پھر آپ خفا ہونے لگیں گے (رنجی نگاہیں کر کے) کیا اچھا ہوتا اگر ایک نظر اسے بھی میں دیکھ لیتا۔ اس کی مہربانی تو دیکھ لی قہرمانی بھی دکھا دیجیے" تصویر کے دونوں رخ دیکھنے چاہییں۔ بے حکم! یہ کہہ کر ڈرتے ڈرتے جو نظر اٹھائی تو چٹیل میدان، نہ وہ بزرگ ہیں نہ ان کی کرامت کے کرشمے۔ گھبرا کر آنکھ کھل گئی۔ صبح ہو چکی تھی کلمہ پڑھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ قریب کے چشمے سے وضو کیا، نماز پڑھی اور ایک نئی قسم کا سرور لیے ہوئے شہر کی طرف چلا۔ سچ پوچھو تو میری زندگی کی پہلی اور اصلی عید یہی تھی۔

(ماخوذ)

اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

مفلسی بھی دنیا میں ایک عذاب ہے۔ مفلسوں کو کائنات کا ہر ذرہ دیدے نکال نکال کر دیکھتا ہے قدرت کی ہر نعمت ان کے لیے ایک مصیبت ہوتی ہے اور تو اور موسم بھی ان کو خوش نہیں کر سکتے۔ گرمی آتی ہے امیروں کی مسہریاں جستوں پر صحنوں میں بچھ جاتی ہیں پنکھوں سے مصنوعی ہوا پیدا کی جاتی ہے گلاب اور کیوڑے کے شربت برف سے ٹھنڈے کئے ہوئے موجود ہیں۔ باغوں میں ہوا خوری ہوتی ہے خس کی ٹٹیاں لگتی ہیں۔ چھڑکاؤ ہوتے ہیں۔ کپڑوں میں باریکیاں نکلتی ہیں غریبوں کے پاس کپڑے ہی نہیں کہ باریکیاں نکالیں مکان ہی نہیں کہ چھڑکاؤ کریں اور مسہریاں بچھائیں برف تو ایک طرف ٹھنڈے پانی کو بھی ترستے ہی ترستے گرمی گزر جاتی ہے۔

جاڑا آیا کہ دولت مندوں نے لحاف بنائے کمبل خریدے توشکیں بھروائیں گرم سوٹوں کے لیے آرڈر دیئے۔ دوشالے آگئے۔ بنیان جرابیں سوئٹر ہر چیز حاضر ہے۔ انگیٹھیوں کا انتظام ہوگیا گرم پانی ہر وقت موجود۔ خون کو گرمانے والی غذائیں مقوی معجونیں ماء اللحم کھانا پینا شروع ہوا۔ نادار بیچارہ کیا کرے سر چھپانے کو کسی جانور کا بھٹ بھی نہیں کھانے کو سوکھے ٹکڑے بھی نہیں۔ بدن پر دو پھٹے چیتھڑے تک نہیں۔ ٹھنڈی ہواؤں سے بھرے ہوئے آسمان کو اوڑھے یا برف اگلنے والی زمین کو بچھائے۔

رکھا ایک آٹھ ٹکے کا مزدور تھا۔ حد درجہ کا غریب۔ غریب ہی پیدا ہوا تھا۔ غریب ہی گود میں پرورش پائی تھی۔ غریب باپ کا بیٹا تھا اور غریب دادا کا پوتا گویا غربت اس کو ورثے میں ملی تھی۔ مفلسی ان سب کی ماں تھی اور مفلسی ہی باپ۔ ان کی شادیاں ہوئی تھیں غریب اولاد پیدا ہوتی تھی اور غریب ہی مر جاتی تھی۔ ناداری ان کا آغاز تھا اور ناداری ہی انجام۔

روپیہ۔ ایک روپیہ۔ سولہ آنہ کا روپیہ۔ رکھا نے کبھی دیکھا نہ تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ روپیہ کیسا ہوتا ہے۔ اور کس طرح خرچ کیا جاتا ہے۔ اس کی دنیا تو چار آنہ میں تھی وہ بھی کبھی میسر آتے تھے اور کبھی نہیں۔ اس کا باپ جب مرا ہے تو ان کے گھر میں نو پیسے تھے ورثہ کی اس رقم کو اس نے بڑی حفاظت سے ایک ٹوٹی ہوئی ہنڈیا میں چھپا کر جھونپڑی کے ایک کونے میں دبا دیا اور بدستور اپنا کام کرنے لگا۔

گرمی گزری جاڑا آیا۔ رکھا کے ہاتھ پاؤں ٹھٹھرنے لگے جس قدر سردی زیادہ ہوتی رکھا کام نہ کر سکتا۔ مزدوری کو جاتا۔ دس گیارہ پیسوں سے زیادہ ہاتھ نہ آتے۔ پچھلی سردیاں دونوں میاں بیوی نے ایک پھٹے ہوئے کمبل میں کاٹ دی تھیں اب وہ کمبل بھی چھلنی ہو گیا تھا۔ اناج بھی پیٹ بھر کر نہیں ملتا تھا کہ اسی کی گرمی سے راتیں بسر ہوں۔ رکھا کا خزانہ بھی خالی ہو گیا تھا۔ ادھر ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ سردی اور برسات نے کام مزدوری بھی جاتی رہی۔ فاقے پر فاقے ہونے لگے۔

گڑگڑاتی سردی ہو یا موسلا دھار برسات۔ پیٹ کسی کو نہیں مانتا۔ چار روز سے رکھا اور اس کی بیوی کو کچھ میسر نہیں آیا تھا بارش بھی تھمی ہوئی تھی۔ رکھا بھوک اور سردی کا مارا ہوا گھر سے نکلا۔ بادل چھٹ گئے تھے۔ دھندلا دھندلا سورج زمین کی چھاتی پر اپنی مدھم شعاعیں ڈال رہا تھا۔ سڑک پر پہنچ کر رکھا نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنی پھٹی ہوئی گدڑی کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اپنے سینے پر چھپا لیا اور جلدی جلدی

قدم اٹھاتا ہوا شہر کی طرف بڑھا۔

اپنی حالت کے مطابق مزدوری کی دعائیں مانگتا۔ دل کو ڈھارس دیتا خاموش چلا جا رہا تھا کہ ایک موٹر ہوا سے باتیں کرتی ہوئی پیچھے سے آئی اور خیالات میں ڈوبے ہوئے رکھا کے پاس سے گذر گئی۔ قریب ہی کیچڑ اور پانی سے بھرا ہوا ایک گڑھا تھا موٹر کے پہیے سے وہ کیچڑ اور پانی اچھلا اور رکھا غریب نہا گیا۔ تہمد اور کمری دونوں شرابور ہو گئے۔ سردی میں ٹھٹھرے ہاتھوں سے رکھا نے اپنے کپڑے نچوڑے۔ کیچڑ جھاڑی ٹھنڈا سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا "اللہ میاں! یہ تمہارا انصاف ہے؟ دو چیتھڑے بدن پر ہیں۔ ان کو بھی تو نے بھگو دیا۔ تیرے امیر اور مزدور بندے انھیں بھی خشک نہیں دیکھ سکتے۔ اچھا! تیری مرضی مگر یہ موٹریں ہمیشہ نہیں رہیں گی" اور آگے بڑھا۔

اب اس نے مزدوری کا خیال ترک کر کے بھیک مانگنے کا ارادہ کیا۔ اس کے نزدیک بھیک مانگنا اچھا نہ تھا اور نہ آج تک اس کے خاندان میں کسی نے بھیک مانگی تھی مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ ہاتھ پاؤں جواب دے چکے تھے۔ خالی ہمت سے کیا نہ کرتا اس نے بھیک مانگنی شروع کی راہ میں جو ملتا اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیتا۔ بھیک مانگنا بھی ایک فن ہے وہ اس کو نہیں آتا تھا اس لیے کسی نے رکھا کو جھڑک دیا۔ کسی نے بھی دی کوئی گھورتا ہوا نکل گیا۔ ایک سوٹ بوٹ والے نوجوان کے آگے اس نے ہاتھ پسارا اور گڑگڑا کر منھ سے بھی کچھ کہا۔ نوجوان دو چار قدم آگے جا کر رک گیا اس کے دل میں امید کی ایک جھلک پیدا ہوئی یہ قریب پہنچا۔ نوجوان نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ رکھا دعائیں دینے لگا لیکن جب نوجوان نے سگرٹ کی ڈبیا اور دیا سلائی کا بکس نکال کر سگرٹ سلگایا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا تو رکھا کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔

آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ دو نوجوان، ایک عورت اور ایک مرد جو کسی امیر گھرانے

کے معلوم ہوتے تھے۔ ایک ریسٹورنٹ سے نکل کر باتیں کر رہے ہیں۔ اس نے ان کے قریب جا کر سلام کیا اور ڈرتے ڈرتے سوال کیا "بھوکے کو ایک پیسہ۔ خدا کے نام پر ایک پیسہ" دونوں باتوں میں محو تھے۔ رکھا نے پھر کہا "چار روز سے بھوکا ہوں حضور ایمان......" فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ عورت چڑ کر بولی "بھوکا ہے تو یہاں تیرے باوا کا صدا برت نہیں لگ رہا چل آگے دفع ہو" رکھا مایوس کھڑا تھا۔ نوجوان نے ڈانٹ کر کہا "جاتا ہے یا پٹ کر جائیگا۔ ان بھیک منگوں کو موت بھی نہیں آتی گورنمنٹ بھی ان کا بندوبست نہیں کرتی جہاں دیکھو راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

کئی گھنٹے تک رکھا بازاروں میں چکر لگاتا رہا کسی خدا کے بندے نے ترس کھا کر ایک دھیلا بھی اس کے ہاتھ پر نہ رکھا۔ لوگوں کی آنکھیں بھی تھیں دل بھی تھے ان کے پاس دولت بھی تھی اور دولت نہ تھی تو از کم رکھا جیسے کنگال بھی نہ تھے۔ مگر رکھا کیواسطے نہ ان کی آنکھیں تھیں نہ ان کے دل تھے رکھا اگر پیٹ کا بھکاری تھا تو یہ سارے کے سارے ہمت کے بھکاری تھے۔ آخر تھک کر یہ واپس چلا۔ آدھے رستے پر پہنچ کر پھر اس کو خیال آیا کہ جا کیا کہے گی۔ عورت چار دن سے بھوکی پڑی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے چاروں طرف دیکھا سامنے سڑک کے کنارے ایک کوٹھی تھی ہمت کر کے اس کا بند پھاٹک کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کوٹھی کے گرد خاصہ بڑا باغیچہ تھا۔ سڑک چکر کھاتی ہوئی کوٹھی تک پہنچی تھی۔ دس بارہ قدم ہی یہ اندر کی طرف بڑھا تھا کہ قریب کے درختوں میں سے نکل کر ایک خوفناک شکل کا کتا بھوں بھوں کرتا ہوا رکھا پر لپکا۔ رکھا کا خون خشک ہو گیا اور بے تحاشا کوٹھی کی طرف بھاگا۔ آگے رکھا تھا اور پیچھے کتا۔ کوٹھی کے قریب پھولوں کے گملوں کی قطاریں تھیں بے اوسانی میں ان سے الجھ کر گرا۔ بیماری اور فاقوں کا مارا ہوا گرتا پڑتا بھاگ رہا تھا۔ آگے کوٹھی تھی کہ ایک صاحب بہادر اندر سے نکلے۔ انھیں دیکھتے ہی کتا رکھا کا پیچھا چھوڑ کر ان کے پاؤں پر لوٹنے لگا دیکھئے!

غربت اور امارت کا فرق۔ جانور بھی، میرے جوتے چاٹتے ہیں اور غریب کی بوٹیاں نوچنے کو دوڑتے ہیں۔

صاحب بہادر نے کتے کو پیار کرکے رکھا پر نظر ڈالی۔ بیچارہ سردی اور خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہاتھ اور گھٹنے زخمی تھے۔ انھوں نے رکھا سے کوئی سوال نہیں کیا لاپروائی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو روپے نکالے اور رکھا کی طرف پھینک کر کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ رکھا کچھ دیر تک اسی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھے۔ زمین پر پڑے ہوئے روپئے اٹھائے اور کوٹھی سے باہر نکلا۔ اب اس کا چہرہ بشاش تھا ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی سردی کا ڈر تھا نہ زخموں میں تکلیف اس کی مٹھی میں دو روپے تھے دو روپے۔ جو کبھی اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے وہ دولت مند تھا۔ دو روپے کا مالک۔

جیا رکھا کی بیوی جھونپڑی میں بیٹھی پھٹے ہوئے کمبل میں ٹاٹ کے ٹکڑے تھوپ رہی تھی رکھا کو خالی ہاتھ آتے دیکھ کر بولی "کچھ نہیں ملا۔ خالی ہاتھ آئے کسی درخت کے پتے ہی لے آئے ہوتے کہ پیٹ کو گڑھا تو بھر لیا جاتا۔" رکھا نے کوئی جواب نہیں دیا وہ جیا کو بھینی بھینی نگاہوں سے دیکھا کیا اور کھڑا مسکراتا رہا۔ اتنے میں اس کی نگاہ زخمی گھٹنے پر پڑی۔ گھبرا کر کھڑی ہو گئی "ہے ہے یہ چوٹ کیسے آئی یہ سردی اور اس میں یہ چوٹ۔ کیا کہیں گر پڑے" اس پر بھی رکھا کچھ نہ بولا وہ برابر ہنستا کیا جب تنگ آگئی تو ذرا چیخ کر بولی۔ "گونگے ہو گئے کیا؟ بولتے کیوں نہیں!" رکھا نے اکڑ کر ایک عجب انداز سے دو روپے چھن سے جیا کے آگے ڈال دئے۔

پیاس کی شدت میں پانی سے مایوس ہونے کے بعد برف کے شربت ملنے کی خوشی بھوک کے تڑاقوں میں سوکھی ہوئی چنوں سے بھی نا امید ہو کر گرما گرم پلاؤ کی قاب کا ہاتھ لگ جانا۔ ایک ایسی سچی مسرت ہوتی ہے جو بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی میسر نہیں آتی

بھوکے رہ کر دیکھیے کہ روٹی کے سوکھے ٹکڑوں میں کیا مزہ آتا ہے۔ سردی میں دانت سے بج رہے ہوں کلیجہ کانپ رہا ہو۔ تو بھٹیاری کا سڑا ہوا لحاف بھی کشمیر کے گدوں کا لطف دیتا ہے۔

ان شیتی مفلسوں سے پوچھیے کہ دو روپے کو انھوں نے کیا سمجھا۔ رکھا اور جیا کی خوشی کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر ان جیسی حالتیں گزری ہوں۔ دونوں ہنستے دیتے تھے نہ بھوک رہی تھی نہ سردی مگر رکھا بازار جانے کے لیے بے چین تھا کہ جشن جمشیدی کی تیاری کرے۔ جوں توں کرکے زخموں پر پٹیاں باندھیں دو روپے کی کہانی سنائی اور جیا کو ہنستا ہوا چھوڑ کر پھر شہر کی طرف لپکا۔ لیکن اب یہ وہ رکھا نہیں تھا جو کوڑی کوڑی کو محتاج تھا جس نے بھیک مانگنے کی ذلت بھی گوارا کر لی تھی۔ رکھا اب روپے والا تھا اب اس کے دل میں طاقت تھی۔ اب ساری دنیا کے مغرور دولت والے اس کی آنکھوں میں حقیر تھے۔

سردی سے بچنے کے لیے ایک کمبل کی ضرورت تھی۔ جیا کے پاس صرف ایک جوڑے کے سوا جس میں پیوند ہی پیوند تھے اور جس کو وہ غریب دوسرے تیسرے روز کسی تالاب پر جا کر دھو لیا کرتی تھی کوئی کپڑا نہ تھا۔ تیل، سرمہ، کنگھی کے لیے بھی وہ دنوں سے ترس رہی تھی مگر رکھا کی ملکیت میں صرف دو روپے تھے۔ سب سے پہلے اس نے ایک روپیہ کا آٹا ایک آنہ کی دال اور ایک آنے میں ہلدی نون مرچ وغیرہ خریدے۔ آگے بڑھ کر گدڑی والوں میں سے بارہ آنے کا ایک پرانا کمبل لیا۔ چلتے ہوئے دو پیسے کے بھنے ہوئے چنے بھی لے لیے تاکہ روٹی پکتے پکتے کچھ سہارا ہو جائے باقی کے چھ پیسے انٹی میں لگا لئے یہ اس کا ریزرو فنڈ تھا۔

غریب کے جذبات بھی غریب ہوتے ہیں۔ انسان کا حسن بھی مفلس ہوتا ہے اور اس کی محبت بھی۔ رکھا اپنی بیوی کے ساتھ نہ محبت کا اظہار کر سکتا تھا نہ اس کے

حسن کی قدر کنگھی۔ سرمہ۔ تیل مسی کی معمولی فرمائش بھی پوری نہ کر سکا۔ دو روپیہ بارہ آنہ کے بعد بھی کئی مرتبہ اس نے جیا کا خیال کیا۔ اس کے روکھے بال، پھیکی پھیکی آنکھیں یاد آ گئیں۔ انٹی میں سے پیسے بھی نکالے اور ایک ٹھنڈا سانس لے کر پھر رکھ لیے۔ اب وہ لدا پھندا گھر ہستی کا سامان کا پوٹلا سر پر رکھے لپکا ہوا اپنی جھونپڑی کی طرف جا رہا تھا۔ سڑک سے اتر کر کوئی چار سو قدم جھاڑیوں میں سے گزرنے کے بعد اس کی جھونپڑی تھی۔ پگڈنڈی کا راستہ برسات سے خراب ہو گیا تھا اور اس لئے رکھا قدم قدم پر ٹھٹکتا ہوا پھیر کھاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ چند درختوں کے جھنڈ میں رسی سے بندھا ہوا ایک شخص بالکل ننگا پڑا ہوا نظر آیا۔ رکھا "مار ڈالا رے مار ڈالا" کہتا ہوا قریب پہنچا۔ دیکھا تو یہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ آنکھیں بند۔ منہ کھلا ہوا۔ ہاتھ پاؤں رسی سے جکڑے ہوئے رکھا ڈرا چاہا بھاگ جائے۔ پھر کچھ سوچا۔ سامان کی پوٹ اتار کر زمین پر رکھی ادھر ادھر دیکھا۔ قریب پہنچا "ارے زندہ ہے" کہہ کر نوجوان کے ہاتھ پاؤں کھولے وہ کسمسایا تو اس نے سردی سے اینٹھے ہوئے بدن پر کمبل ڈال دیا۔ گرمی پا کر نوجوان نے آنکھیں کھول دیں۔ رکھا نے سہارا دے کر اس کو بٹھایا اور اپنی گمری اتار کر دی "یہ گمری پہن لو۔ ہے تو پھٹی ہوئی مگر دھاونوں کی سردی سے کچھ نہ کچھ بچاؤ ہو جائے گا" نوجوان نے رکھا کا شکریہ ادا کیا اور گمری پہن لی اب رکھا نے کمبل تو اپنی ٹانگوں سے لپٹا اور تہمد کھول کر نوجوان کو دیا تاکہ وہ ستر پوشی بھی کر سکے۔ چھ پیسے بھی حوالہ کر دئے کہ بھوکے معلوم ہوتے ہو کچھ کھا لینا" نوجوان رکھا کی ہمدردی سے متاثر اس کی طرف دیکھتا ہوا سڑک پر جا کر سول لائن کی جانب روانہ ہو گیا۔ اور رکھا نے اپنی جھونپڑی کا رستہ لیا۔ غریب کی ہمدردی کا جذبہ کس قدر مخلصانہ ہوتا ہے۔ رکھا خوش تھا کہ اس کی کمائی ایک خدا کے بندے کے کام آئی۔

سول لائن میں منجھ کی جگہ ایک عالیشان کوٹھی ہے۔ دروازہ پر دو دو گورکھے پہرا

دسے رہے ہیں اور چپراسی - بابو - اس کمرے سے اس کمرے میں آجا رہے ہیں - برآمدہ میں موٹر کھڑی ہے بیچ کے وسیع کمرے میں اس علاقہ کے مشہور اور دولت مند ٹھیکیدار خان بہادر افسر دیکھے خاں ایک کوچ پر تکیہ لگائے پیچوان پی رہے ہیں۔ کمرے کی ہوا خمیرے کے دھوئیں سے معطر ہے ایک بوڑھا شریف صورت شریف وضع سامنے کرسی پر بیٹھا ہے آزادی اور کسی قدر بے تکلفی سے باتیں ہو رہی ہیں یہ ضعیف شخص خان بہادر کا سکریٹری بجائے خود سمجھنا ہے جو اپنی کاروباری قابلیت کے سبب دور دور تک شہرت رکھتا ہے۔

خان بہادر :- اچھا تو پچاس ہزار کا چک لکھیے ٹھیک ہے نا!

سکرٹری :- اس فنڈ میں غالباً یہ سب سے بڑی رقم ہوگی - میری رائے میں بہت مناسب ہے۔

خان بہادر :- نئے ٹھیکہ کے لیے کوئٹہ کب جانا چاہیے۔

سکرٹری :- آپ خود تشریف لے جائیں گے یا کسی کو بھیجیے گا ؟

خان بہادر :- تم جاؤ گے! میری کیا ضرورت ہے پرسوں چلے جاؤ ویسے میں بڑے صاحب بھی وہاں موجود ہیں -

سکرٹری :- پرسوں جانا ہے تو کل موٹر روانہ کر دی جائے اسی ہزار کا انتظام تو آج ہو گیا ہے۔

خان بہادر :- بس اب تم جا سکتے ہو۔ آج بہت کام کرنا پڑا ہے تھک گئے ہو گے۔

سکرٹری :- کام زیادہ تھا مگر زیادہ تھکانے والا نہیں تھا۔

خان بہادر :- تم نے چا پی ؟ کوئی ہے -

سکرٹری :- میرے مکان پر بھی چا تیار ہوگی -

خان بہادر :- نہیں پی لو - میں بھی پیوں گا۔ آج ابھی تک فرصت نہیں ملی -

نوکر حاضر ہوتا ہے "چا لاؤ" کہہ کر خان بہادر پھر باتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں

خان بہادر :- اب تو تمہیں کھانسی کی شکایت نہیں رہتی۔

سکرٹری :- جب سے آپ نے وہ گولیاں بنوادی ہیں بہت کم شکایت باقی ہے۔
چیرا آجاتی ہے۔

سکرٹری :- اچھا رکا ایک گھونٹ لے کر آپ نے وہ قصہ نہیں سنایا۔

خان بہادر :- کون سا قصہ ؟

سکرٹری :- پچھلی سوموار کو جو خوری سے آتے وقت ایک فقیر کو دس روپیہ کا نوٹ دینے کے بعد مجھے حیران دیکھ کر آپ نے فرمایا تھا کہ حیرت کی کیا بات ہے مجھے ایسی خیرات میں بے حد لطف آتا ہے اس سلسلہ میں ایک واقعہ ہے کبھی سناؤں گا" خان بہادر نے ایک قہقہہ لگا کر کہا "یاد ہے ہاں یاد ہے تم کو بھی خوب یاد رہا۔"

سکرٹری :- ہاں تو ارشاد ہو۔ میں تو اسی روز سے سننے کے لئے بے چین ہوں۔

خان بہادر :- پھر کبھی سنا دوں گا۔ اب تو تم جاؤ۔ بال بچے منتظر ہوں گے۔

سکرٹری :- آپ میرے اشتیاق کو بڑھاتے ہیں اور کچھ بھی نہیں مجھے ایک شبہ ہوتا ہے۔

خان بہادر :- (مسکراتے ہوئے) شبہ کیا ؟

سکرٹری :- معاف فرمائیگا۔ میرا دماغ اس طرف جا رہا ہے کہ جو کچھ آپ سنانا چاہتے ہیں۔ اس کا شاید آپ کی ذات سے تعلق ہے۔

خان بہادر :- (اپنے سکرٹری کو غور سے دیکھ کر) تمہارا گمان صحیح ہے۔ اگر تمہیں اصرار ہے تو سنو۔ میں بھی کبھی اس فقیر کی طرح غریب تھا۔ مگر آٹھ ٹکے کا مزدور بھیک منگا نہیں۔ بڑی تنگ حالی سے گزرتی تھی۔ وہ فقیر تھا اور پیشہ ور فقیر۔ اس کی ظاہری حالت مجھ سے بہت بہتر تھی جب میں نے اس کو دس روپیہ کا نوٹ دیا تو اس کے چہرہ پر کوئی تغیر نہ تھا۔ اس کی غربت مصنوعی تھی۔ اس لئے احسان مندی کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ لیکن میری حالت اس سے کہیں بری تھی جس دن کا میں ذکر رہا ہوں مجھے اور میری بیوی کو آٹھ وقت کا فاقہ تھا

فاقوں سے تنگ آکر بھیک مانگنی چاہی وہ بھی نہ ملی۔ ایک بنگلہ میں گھسا کہ شاید مٹھی بھر چنے ملیں وہاں کتوں نے تواضع کی۔ بنگلہ کے مالک کو رحم آیا کتوں سے نجات دلائی اور دو روپے میرے آگے پھینک دیئے۔ میرا دل ممنون تھا مگر اظہار کی طاقت نہ تھی۔ جب وہ صاحب اندر چلے گئے تو بڑی ہمت کر کے میں نے روپیہ اٹھائے۔ گھر گیا اور گھر سے بازار ایک روپیہ ساڑھے چودہ آنے میں کمبل آٹا نمک مرچ دال وغیرہ خریدی اور واپس گھر کے قریب ایک مظلوم پر نظر پڑی جس کو چوروں نے لوٹ کر نیم مردہ حالت میں چھوڑ دیا تھا۔ باوجود اپنی مصیبت کے مجھے اس پر ترس آیا۔ اپنی پھٹی ہوئی کمری۔ اپنا تہمد۔ اور اپنی کل نقدی جو صرف چھ پیسے تھی اس کے حوالہ کی اور اپنی جھونپڑی کا رخ کیا۔ تم جانتے ہو کہ اپنی ساری پونجی کسی کو دے ڈالنا کتنا مشکل کام ہے لیکن میں نے یہ جانتے ہوئے کہ بھیک مانگنا مجھ کو سزاوار نہیں۔ مزدوری ہو نہیں سکتی۔ دوسری کمری دوسرا تہمد نہیں۔ چھ پیسے خدا معلوم میرے کس کس کام آتے یہی میرا سب کچھ ہے اور میں نے اپنا سب کچھ اس شخص کے حوالہ کر دیا میں خوش تھا کہ میں کسی کی مصیبت میں کام آیا۔" بوڑھا سکرٹری کرسی پر سنبھل کر بیٹھا۔ اپنی عینک رومال سے صاف کی اور کھنکار کر بولا۔

سکرٹری:۔ تو گویا آپ نے اس حالت میں بھی اپنے مذہب کا صحیح نمونہ پیش کیا۔ دکھیا ہو کر دکھیا کی مدد کی۔

خان بہادر:۔ جو کچھ تم سمجھو...... اس شخص نے مجھے آواز دی۔ میرا نام اور میرا پتہ پوچھ کر ایک طرف چلا گیا۔ میں اپنی جھونپڑی میں آگیا۔ آٹا دال نون مرچ کئی دن کے کھانے پینے کا سامان لے آیا تھا اس لئے گذری ہوئی ساری باتیں بھول گیا۔ ایک دن دلہن میں اپنی جھونپڑی کے آگے دھوپ میں لیٹا ہوا تھا۔ میری بیوی چولھے میں آگ جلا رہی تھی کہ سامنے سڑک پر ایک موٹر رکی اور اس میں سے ایک معزز شخص اتر کر میری جھونپڑی پر آیا اور پوچھنے لگا کہ "رکھا مزدور یہیں رہتا ہے" میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب

میں نے دیکھا کہ یہ شخص وہی نوجوان ہے جس کو میں نے درختوں کے جھنڈ میں رسیوں سے بندھا پایا تھا اور جسے میں نے اپنی پھٹی ہوئی گُدڑی پہننے کو، میلا کچیلا تہہ باندھنے کو چند پیسے روٹی کھانے کو دئے تھے۔

سکریٹری :۔ اچھا! آخر وہ کون تھا؟

خان بہادر :۔ سنو جی! بیچ میں نہ بولو۔ ہاں تو میں کھڑا ہو گیا اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور سلام کرکے کہا۔ کہئے! رکھا میرا بھی نام ہے۔

سکریٹری :۔ (بیتاب ہوکر) کوئی بڑا رئیس ہوگا۔ کیوں ایسا ہی تھا نہ؟

خان بہادر :۔ (مسکرا کر) پھر بولے۔

سکریٹری :۔ کیا کوئی سرکاری عہدیدار تھا۔

خان بہادر :۔ (ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے) نہیں! وہ اس ٹھیکیدار کمپنی کا مالک تھا۔ جس کا آج میں ہوں۔

سکریٹری :۔ اس فرم کا مالک۔ اتنی بڑی فرم کا جس کے ...

خان بہادر :۔ ہاں ہاں۔ اسی فرم کا اسی فرم کا۔

سکریٹری :۔ درست درست۔ اس سارے کارخانہ کا وہ مالک تھا۔

خان بہادر :۔ احمق ہو۔ آج تم اس قدر بیوقوف کیوں بن گئے۔

سکریٹری :۔ تعجب ہے۔

خان بہادر :۔ تعجب کی بات ہے اچھا سنو۔ پہلے تو میں ذرا غریب کو تیز ہوا سے ڈرتا گیا وہ تو موٹر والا بڑا آدمی تھا لیکن جب اس نے مصافحہ کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور میرے پاس زمین پر بیٹھ کر میرا شکریہ ادا کیا تو میری جان میں جان آئی۔

سکریٹری :۔ کوئی بڑا شریف تھا۔ زمین پر بیٹھ گیا۔ بغیر کرسی بغیر فرش کے بیچارے کے سارے کپڑے خراب ہو گئے ہوں گے۔ اور آپ نے اس کو زمین پر بیٹھنے دیا۔

خان بہادر:۔ عجیب آدمی ہو۔ بولے جاتے ہو۔
سکریٹری:۔ ہاں تو وہ آپ کے پاس زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر کیا ہوا۔
خان بہادر:۔ وہ مجھے اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر لے گیا مزدوروں کے جمعدار کی نوکری دی اور اپنے ایک بابو سے کہا کہ اسے لکھنا پڑھنا سکھاؤ۔ محنت، مشقت اور ہر تکلیف کا برداشت کرنا میری گھٹی میں پڑا ہوا تھا نہ اب محنت سے جی چراتا ہوں نہ جب محنت سے تھکتا تھا۔ دن بھر مزدوروں کی نگرانی کرتا اور رات کو بابو صاحب سے اردو انگریزی اور حساب پڑھتا تقدیر سامنے تھی اور مالک مہربان۔ ترقی شروع ہوئی اور میں نے پرائیویٹ انٹرنس پاس کیا اور اس نے مجھے اپنا سکریٹری بنا لیا۔
سکریٹری:۔ جیسا میں آپ کا سکریٹری ہوں۔ تنخواہ بھی اتنی ہی ہوگی۔
خان بہادر کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ غصہ کو ضبط کر کے بولے، لیکن افسوس۔ ایک رقیب ٹھیکیدار نے اس کو زہر دیدیا اور وہ جوان مرگیا۔ بڑا نیک انسان تھا۔ خدا اس کو جنت میں جگہ دے۔
سکریٹری:۔ ارے رے رے بڑا غضب ہوا۔ آپ کی تو ساری امیدوں پر پانی پھر گیا ہوگا
خان بہادر:۔ ہاں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا اگر وہ مرتے وقت مجھ کو بھول جاتا۔
سکریٹری:۔ کیا کہا۔ اگر وہ بھول جاتا۔
خان بہادر:۔ مرتے مرتے وہ میرا احسان نہیں بھولا تھا اس نے وصیت نامے کے ذریعہ سے اس فرم کا مالک مجھے قرار دیا اور اپنا سارا کاروبار میرے حوالہ کر گیا اس طرح دنیوں کا محتاج رکھا آج نعمن بہادر راشد رکھا خان ہے۔ یہ کہہ کر خان بہادر نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور کھڑے ہو گئے۔
سکریٹری:۔ (کھڑے ہو کر) آپ نے مجھے چھڑے ایک مصیبت زدہ ذہن ہے... درجے پیسے دے اس واسطے آپ کو یہ ملا۔ میں نے ایک فقیر کو کتوں سے بچا کر دو دو پیسے دیے

اس کے بدلہ میں دیوالہ نکلا۔ برسوں بے در بے گھر حیران پریشان رہا۔ اگر آپ مہربانی نہ فرماتے تو پرماتما جانے کیا درگت ہوتی۔

خان بہادر:۔ ایک دولت مند خان بہادر ٹھیکیدار کے سکریٹری ہو۔ دو سو روپے ماہوار تنخواہ۔ بنگلہ رہنے کو۔ یہ ایک غریب کو دو روپے دینے کا پھل نہیں تو کیا ہے۔

سکریٹری:۔ آپ کے مقابلہ میں تو یہ پھل بہت ہی کم ہے۔

خان بہادر:۔ لیکن خدا نیتوں کو دیکھ کر پھل دیا کرتا ہے۔ تمہارے دو روپے اس وقت کی تمہاری حیثیت کے لحاظ سے کچھ بھی نہ تھے۔ دو روپے روز کے شاید تم سگرٹ پی جایا کرتے ہوگے۔ اس کے مقابلہ میں تم اس مزدور کی ہمت پر غور کرو جس نے بلا تردد اپنا سب کچھ ایک شخص کو بغیر مانگے دے دیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے خان بہادر صاحب بوڑھے سکریٹری کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے باہر آئے اور موٹر کے پائدان پر پاؤں رکھ کر اس کے کان میں کہا۔

سیٹھ بھجا تھ جی! میں نے دو روپیہ دینے والے جنٹلمین کو اسی دن پہچان لیا تھا جب وہ ملازمت کے لئے میرے پاس آیا ہے" اور ہنستے ہوئے آواز سے یہ کہہ کر سوار ہو گئے۔

"خدا بہت بڑا منصف ہے اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ چھ پیسوں اور دو روپوں میں بڑا فرق تھا۔"

موسارانی

اگلے زمانہ کا قصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ آبادی سے دور بہت دور دریائے گنگا کے کنارے ایک جوگی رہتا تھا۔ جنگلی درختوں کے کنج میں چھوٹی سی کٹیا بنالی تھی سب سے الگ خاموش۔ نچنت رات دن گیان دھیان میں لگا رہتا۔ صبح اشنان کو نکلتا بھگوان کی جپ کرتا۔ اس کی قدرت کا سماں دیکھتا بن باسیوں اور جنگل کے پکھیروؤں کے گیت سنتا۔ ادھر ادھر چرتا رہتا۔ رات کو اپنی کٹیا میں آجاتا۔ دنیا کو تج دیا تھا۔ پرماتما کی لو لگی ہوئی تھی اس لئے مایا اور مایا کے سارے جلوے بھلا دئے تھے رہنا بھی ایسی سنسان جگہ اختیار کیا تھا جہاں آدمی تو آدمی آدم زاد کا خیال بھی نہ آئے۔ جوگی عموماً انسانوں سے تو گھبراتے ہیں لیکن جانوروں سے انھیں خاص انس ہوتا ہے۔ مور طوطے کبوتر ہرن بارہ سنگھے گائے بیل پالتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال ان کے یوگ میں خلل نہیں ڈالتی۔ اس جوگی میں یہ بات بھی نہ تھی۔ نہ طوطوں کے چہلے اسے لبھا سکتے تھے نہ ہرنوں کی ڈاریں، نہ کوئی دوسرا چرند یا پرند کٹیا کے پاس آسکتا تھا۔ آتا کیوں کر؟ جوگی کے پاس نہ ان کے لبھانے کا کوئی سامان تھا نہ اس سے کوئی دلچسپی۔ ایک بھگوان کے سوا دنیا میں کسی سے اپنایت نہ تھی۔

ایک چوہیا نہ جانے کس طرح کٹیا میں بل بنا لیا تھا۔ وہ ندرا کی تھیلی پھرا کرتی تھی

جوگی چوہیا سے پیار نہ کرتا۔ پہچل کھاتا۔ یہ اسی کے بچے کھچے پر گزارا کرتی عمر ہستی ہوتا تو شاید کچھ بھی کھاتا اور کچھ نہ سہی اسے مرزی تو ضرور کہتا۔ مگر ایک جیتی ستی کا یہ دھرم نہ تھا کہ وہ ننھی سی جان کو نفرت کی نظر سے دیکھتا وہ اس کی گود میں اچھلتی اس کی جٹاؤں سے کھیلتی اس کی جھولی میں گھس جاتی۔ کرا کرا کرتی رہتی یہ دھتکارنے کی بجائے چپکا بیٹھا تکا کرتا۔

رفتہ رفتہ ساتھ رہتے جوگی کو بھی چوہیا کا خیال ہو گیا۔ اپنے ہاتھ سے اسے کھانے کو دینے لگا جب تب سے جب کبھی فرصت ملتی اس کے کودنے اچھلنے کھلاڑیاں کرنے کا تماشا دیکھا کرتا۔ آخر انسان تھا چوہیا سے جی بہلتے دیکھ کر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کیسا اچھا ہو اگر یہ آدمیوں کی طرح بولنے لگے۔ دھیان پہ زور دیا۔ پرمیشور کو کرشمہ دکھانا منظور تھا چوہیا باتیں کرنے لگی۔ جوگی کو خوشی بھی ہوئی اور اپنی طاقت کا گھمنڈ بھی ہو گیا اب وہ اپنا زیادہ وقت چوہیا کے ساتھ گذارنے لگا۔ وہ مزے مزے کی باتیں کیا کرتی اور یہ سنا کرتا۔ ایک دن جوگی جی اپنے آسن پر براجمان تھے۔ دھونی رمی ہوئی تھی۔ یوگ کا نشہ آنکھوں میں تھا۔ چوہیا سے بولے "دیکھا! ہم بھگت ہیں جو چاہیں وہ ہو جائے"۔ چوہیا نے جو دیکھا کہ جوگی جی موج میں ہیں جھٹ گود میں آ کے کہنے لگی "مہاراج آپ کی کیا بات ہے سارے سنسار میں آپ نے نام کر دیا۔ بڑے بڑے رشی مات ہو گئے۔ آپ کی کرپا سے میں بولنے تو لگی ہوں۔ پر اس روپ میں یہ بولی کچھ سہاتی نہیں۔ اس کے سوا دو چار دن سے ایک بلی نہ جانے کہاں سے آ گئی ہے ایسا نہ ہو اندھیرے اجالے کہیں آپ کی یہ داسی اس ہتھیاری کے منہ کا نوالہ بن جائے"۔

جوگی:۔ (مسکرا کر) پھر بچہ تیری کیا مرضی ہے!

چوہیا:۔ مہاتما! بلائی کا بڑا ڈر ہے۔ ایسا کوئی کارن ہو کر میری جان اس سے بچے

مجھے بلی بنا دو۔

جوگی:- رام رام۔ بلی تو بڑی بُری ہوتی ہے کیا ہتھیا کرے گی؟

چوہیا:- میں تو آپ کی بلی ہوں گی۔ کیا اس بنا بلیاں نہیں جیتیں؟

جوگی:- تجھے بلی بننے کا کیا لابھ ہے؟

چوہیا:- مہاراج! ایک تو بلی کو مجھ پر قابو نہیں چلے گا۔ دوسرے اونچی ذات کی ہو جاؤں گی۔

جوگی:- ہنسا۔ اس کی ہنسی میں غرور تھا۔ الاؤ سے راکھ کی ایک چٹکی اٹھائی اور چوہیا پر ڈال دی۔ دیکھتے دیکھتے چوہیا خوب صورت بلی بن گئی۔ سارے دن جوگی کی گود میں بیٹھی رہتی۔ جوگی سوتا یا دھیان پر جاتا تو یہ بھی ادھر ادھر نکل جاتی درختوں پر چڑھتی کٹیا پر چھلانگیں مارتی۔ پرندوں کا شکار کرتی اور مزے اڑاتی۔

چوہیا نے جو یہ کایا پلٹ دیکھی اور جنگل میں اپنے سے زیادہ طاقت والے جانور نظر آئے تو دل بھر بھرایا کہ ہرن، شیر، چیتے کیسی چھلانگیں مارتے پھرتے ہیں۔ کاش کتا بھی بن جاتی۔ اسی دھن میں کوئی پندرہ بیس روز کے بعد ہی لاڈ میں آ کے کہنے لگی مہاراج جب تک چوہیا تھی۔ یہی کٹیا محل معلوم ہوتی تھی بلی بن کر تو اور ہی دنیا ہو گئی۔ پڑے پڑے دم گھٹا جاتا ہے۔

جوگی:- جنگل دریا کی ہوا کھا آیا کرو۔

بلی:- ہوا تو کھا آؤں پر کتے بھیڑیے جو ستائیں گے۔

جوگی:- اونچے ہونے میں یہی تو مشکل ہے۔

بلی:- کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اور اونچی ہو کر ان میں مل جاؤں؟

جوگی:- یہ آتما اچھی نہیں۔

بلی:- ذرا ہنس کر جوگی کے گھٹنے سے مل کر گرو جی! ایک چٹکی خاک کا خرچ ہے۔ تپسیا کا روپ دھار دو تو بڑی دیا ہو۔ پھر میں مگن رہوں گی۔ کوئی ڈر نہیں رہے گا۔

جوگی: ساری زیادہ وہ بھونکر نہیں چھپائے گی۔ لیکن بلی نے ایسی باتیں بنائیں کہ جوگی اپنی کرامت دکھائے بغیر نہ رہا۔ بیچاری چوہیا بلی سے کتیا ہو گئی۔

قاعدہ ہے انسان ہو یا حیوان جہاں اپنے درجہ سے بڑھا پھر اس کا خیال اونچا ہی ہوتا جاتا ہے۔ ایک خواہش پوری ہوئی کہ ہزار آرزوئیں پیدا ہو جاتی ہیں حد سے گزرا اور قیامت آئی۔ کچھ دن تو چوہیا۔ چوہیا سے بلی۔ بلی سے کتیا بنی ہوئی اپنا روپ دیکھتی رہتی۔ وہ روز نکل جاتی جنگل میں دریا کے کنارے پھرتی۔ کبھی کبھی کوئی مرا ہوا جانور یا مری ہوئی مچھلی دکھائی دیتی۔ کبھی کہیں خرگوش بھی ہاتھ آجاتا۔ پیٹ کو تو روز چاہیے۔ فاقے ہونے لگے۔ آخر تنگ آکر جوگی سے کہنا پڑا۔ "دیوتا! میری جان بچا! یہ روپ تو میرے پران لے لے گا"

جوگی:- کیوں! اب کیا وسواس ہے؟

کتیا:- گر ہاری۔ میں بتاتی کیا ہوں۔ ساگ پات میں جلدی میرا کچا نہیں۔ آپ کے چرنوں میں رہ کر جیو ہتیا کیوں کر کر سکتی ہوں۔ پیٹ نہیں بھرتا۔

جوگی:- مورکھ! اپنے کیے کو بھوگ۔ اب میں کیا بتاؤں؟

کتیا:- مہاراج! یہ مہان کی مورتیاں کیسی گن ہیں۔

جوگی:- (جوش میں آکر) بندریا بننا چاہتی ہے؟

کتیا:- ہاں گرو جی! ذات بھی اونچی ہو جائے گی اور کھانے پینے میں بھی کوئی جتن نہیں کرنا پڑے گا۔ اس کا یہ کہنا تھا۔ جوگی نے ہاتھ ہلایا اور پلک جھپکتے کتیا بندریا تھی۔

مہینوں بندریا اس درخت سے اس درخت پر، شاخ در شاخ کودتی اچھلتی میوے کھاتی چین کرتی پھرتی رہی۔ آیا گرمی کا موسم۔ جوہڑ تالاب خشک ہو کر دلدل بن گئے کنوئیں سے پانی پینا بندر کے بس کا نہیں۔ پیاسی مرنے لگی۔ تالاب میں جنگلی سور دبا کو اندر کیچڑ میں چھپا چھپ کرتے دیکھی تو رشک آیا۔ دل ہی دل سے پانی کو ترسا

کرتی۔ سوروں کی خوشی اور اپنی بے بسی پر رونا آگیا۔ صبر نہ ہو سکا تو جوگی سے فریاد کی اور کہا دیکھا ان سوروں کا بھاگ کیسا اچھا ہے۔ رات دن اشنان کرتے رہتے ہیں۔

جوگی :- اری اس پرتھوی پر سارے سکھ کسی کو میسر نہیں۔ اتنی حرص نہیں کیا کرتے یہ پرماتما کے بھید ہیں۔

بندریا :- پر مہاراج تمہاری چیلی پر تو پرمیشور کی دیا ہونی چاہیئے۔

جوگی :- تو کیا اب تجھے سورنی بنا دوں؟

بندریا :- بھگوان آپ کو اس سے زیادہ شکتی دے۔ کارن کہ میں بندریا کے برن میں بہت دکھی ہوں۔

جوگی :- اچھا لے اور جوگی نے ایک ڈھیلا اٹھا کر بندریا کے مارا۔ بندریا لوٹ کر جو اٹھی تو سورنی کا چولا تھا۔ کئی ہفتے اس طرح بھی گذر گئے۔ صبح ہی نکل جاتی اپنے دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ کبھی اس جوہڑ میں کبھی اس تالاب میں خرمستیاں کرتی۔ کیچڑ اچھالتی اور سورج چھپے جوگی کی کٹیا کے پاس آکر پڑ رہتی۔ خدا کا کرنا کہیں سے رمتا جمتا کوئی ہاتھی آگیا۔ پیاسا تھا سیدھا تالاب میں گھستا چلا آیا۔ سارے سور ڈر کر بھاگنے لگے۔ یہ بھی دور سے ہاتھی کا تماشہ دیکھتی رہی۔

ہاتھی کی شان کا کیا کہنا۔ اس کا ڈیل ڈول۔ اس کی طاقت اور صورت کے تصور سے منہ میں پانی بھر آیا۔ دل میں کہنے لگی کہ یہ جانور ہے پر کتنا خوش نصیب ڈیل ڈول جیسے پہاڑ کا پہاڑ۔ چلے میں زمین ہلتی ہے راجہ اس پر سوار ہوتے ہیں سپنے میں آجائے تو بھاگ کھل جائیں جیسے جی راج پاٹ کی نشانی۔ مر جائے تو ہڈیوں کی قدر۔ میں نے بھی کیا بھول کی جو سورنی بنی۔ ابھی کوئی شکاری آجائے تو میں ہو جاؤں سب جینے میں عزت نہ مرنے پر آبرو۔ اب جوگی جی راہ میں، چلا۔ بنا ہتھنی بنے نہیں رہوں گی۔ جھومتی ہوئی تھرتھنی نکلا ...... کٹیا کی طرف ہولی۔ راستے میں جوگی جی

بھی مل گئے۔ معمول کے خلاف جو اسے آتے دیکھا تو پوچھا" سوریا آج ابھی سے گھر کیسے جا رہی ہے"؟

سورنی:۔ مہاراج دشمن خواب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ کنیا کے دوار سے لگے لگے مر جانا اچھا!

جوگی:۔ کوئی نیا سوانگ بھرنا چاہتی ہے، اس روپ میں بھی کوئی جوگ پڑا؟

سورنی:۔ گرو جی! تم نے اپنی کرامت دکھا کر مجھے کسی ترم کا نہیں رکھا۔ مجھے جانور نہ سمجھو۔ بولی کے ساتھ سارے ارمان آدمیوں کے سے ہیں۔ جو اپنے سے بڑا نظر آتا ہے ویسا ہی بننا چاہتی ہوں۔

جوگی:۔ اب کیا بننا چاہتی ہے۔ کس کو دیکھ لیا؟

سورنی:۔ نہ جانے کہاں سے ہاتھی آگیا تھا۔ صورت دیکھتے ہی جی بے چین ہو گیا۔ ارمان ہے کہ ہتھنی بن جاؤں۔ مہربانی کی ہے تو پوری مہربانی کرو۔ نہیں تو سر ٹپک کر مر جاؤں گی

جوگی:۔ ارے! ایسا پاپ نہ کیجو۔ ہتھنی بننے کا شوق ہے تو ہتھنی بن جا۔ رنکار!" یہ کہنا تھا کہ ایک ہتھنی سامنے کھڑی جھوم رہی تھی۔ ہتھنی کی شکل میں آتے ہی چوہیا ایسی اترائی کہ سارا جنگل کھوندمارا۔ کبھی دریا کو گھنگولتی۔ کبھی درختوں کا ستھراؤ کرتی۔ جوگی ہنستا خوش ہوتا۔ اسی عمل میں جوگی کی کٹیا کی بھی خبر لے ڈالی بساط ہی کیا تھی ایک ریلے میں آپڑی مگر جوگی نے برا نہیں مانا۔ اور کہا تو یہ کہا "کیوں ری شیطاننی میرے سر چھپانے کا جھونپڑا بھی توڑ ڈالا۔ اچھا بدذات جاتی کہاں ہے" ہتھنی نے ملکاری مار کر جواب دیا" مہاراج سب آپ کی مہربانی کا پھل ہے"۔

اب یہ کوسوں کا دھاوا مارنے لگی۔ باغوں میں جا گھس جاتی۔ دریا کے اس پار کہیں سے کہیں جا پہنچی ایک دفعہ ایسے جنگل میں دندنا رہی تھی جو کسی راجہ کی عملداری میں تھا۔ اتفاق سے راجہ شکار کرتا ہوا آنکلا۔ اس کی جو نظر پڑی تو عجب طرح کی چیلی ہتھنی

دیکھی۔ آنکھوں میں کھب گئی۔ ساتھیوں کو حکم دیا کہ جیسے بنے اسے گھیر کر پکڑ لو۔ فوراً سوار اور پیادے دوڑ پڑے۔ گھیر ڈال دیا۔ چوہیا کی تو دلی آرزو یہی تھی کہ ہتھنی بن کر راجہ کی سواری میں رہوں۔ آخر اکڑ کر چلوں وہ کیوں اپنا زور دکھاتی جلدی سے ہاتھ آ گئی۔ راستے میں راج دہانی سے چرکٹے فیلبان بجانے بروار سانٹے مار بھی آ گئے تھے قابو میں کر فیل خانہ میں لے گئے۔ راجہ کا شوق اور ہتھنی کے دل کا ارمان دونوں میں مہاوتوں نے سدھا کر سواری کے قابل بنا لیا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ رانی گنگا اشنان کو جانے والی تھی۔ ہتھنی کو دروازہ پر جھومتا دیکھ کر جی چاہا کہ اسی پہ بیٹھ کر گنگا جائے۔ راجہ نے ہر چند کہا کہ نئی ہتھنی ہے اس پر پہلے پہل رانی کا بیٹھنا جوکھوں سے خالی نہیں مگر رانی نے نہ مانا۔ سوار ہو گئی۔ ہتھنی کے سر میں تو کچھ اور ہی سمائی ہوئی تھی اس نے جو یہ روپ لیا تھا تو فقط راجہ کی سواری کے لیے۔ اس کو رانی کا بیٹھنا بہت برا معلوم ہوا ایسے فیل مچائے کہ عماری الگ جا پڑی اور رانی الگ گری۔ نوکر چاکر دوڑے راجہ بھی محل سے نکل آیا۔ لینا دوڑنا کا شور مچ گیا۔ راجہ کو رانی کے گرنے کا بہت صدمہ ہوا غصے میں حکم دیا کہ اس مستانی کو لے جاؤ اور موٹے دار سانکلیاں پیروں میں ڈال کر قید کر دو ہتھنی نے جو راجہ کو یہ کہتے سنا۔ ساری ہماہمی نکل گئی ڈر کے مارے بھیڑ کو روندتی۔ چنگھاڑتی سونڈ ہلاتی ایسی بھاگی کہ آگے دیکھا نہ پیچھے سیدھی جوگی کی کٹیا پر پہنچ کر دم لیا۔ راجہ نے بھی سمجھا کہ چلو جانے دو بلا ٹلی۔ دکھانے کے لیے مہاوتوں پہ خفا ہو کر چپ ہو رہا۔

جوگی کی کٹیا کے پاس پہنچ کر چوہیا پر پھر نیا خبط سوار ہوا۔ ہتھنی کے روپ کی برائیاں سامنے تھیں۔ اس نے سوچا کہ دنیا میں سب سے بڑھ کر رانی ہے اس سے زیادہ نہ کوئی اونچا ہے نہ اس جیسی کسی کی قدر۔ رانی بن کر سارے سکھ لوٹ سکتے ہیں جوگی کہیں گیا ہوا تھا اس کی راہ میں بیٹھی رہی۔ جب وہ آیا تو یہ آگے بڑھی ہاتھ

ٹیک کر سلام کیا۔ جوگی حیران کہ یہ اتنے دن کہاں رہی اور اب کیسے آئی۔ پوچھنے لگا اب پھر تو مجھے ستانے کیوں آئی ہے؟"

ہتھنی:۔ مہاراج! جانوروں کے روپ میں تو دکھ ہی دکھ ہیں۔

جوگی:۔ پھر؟

ہتھنی:۔ مہاراج! میں چوہیا سے بلّی بنی۔ بلّی سے کتیا۔ کتیا سے بندریا۔ بندریا سے سوری۔ سوری سے ایک دم ہتھنی۔ پر جو سکھ میں چاہتی تھی کہیں نہیں ملا۔

جوگی:۔ سکھ اس سنسار میں کہاں؟ سکھ ملتا ہے تو آپے کو بھولنے سے۔

ہتھنی:۔ نہیں دیوتا۔ جو راجہ مجھے لے گیا تھا۔ اس کی رانی بڑے سکھ سے ہے کوئی اس پر بھی خوش رہ سکتا ہے تو رانی بن کر۔

جوگی:۔ یہ تیری بھول ہے پگلی میں تو غریب امیر تو جھوٹی خوشی مناتے ہیں۔

ہتھنی:۔ مہاتما! پھر آپ نے مجھ پر اتنی دیا کیوں کی؟

جوگی:۔ بھول ہوئی کیوں۔

ہتھنی:۔ اب کے پھر بھول سہی۔

جوگی:۔ اری گھڑی گھڑی بھول میں بھلائی نہیں۔

ہتھنی:۔ مہاراج مجھے نراس نہ کرو۔ میرا مان رکھ لو۔ ایک دفعہ عورت کا روپ دیکر مجھے رانی بنا دو۔

جوگی:۔ نادان جانوروں کے بن سے نکل کر انسانوں کی جون میں نہ جا۔ اس روپ کی کھکیڑ تجھ سے نہیں اٹھ سکے گی۔ اپنی جان سے جائے گی سوانگ الگ سارا جاتی کا ناش ہوگا سو جدا۔

ہتھنی:۔ مہاراج میں جانتی ہوں کہ تم یہ روپ نہیں دے سکتے اس لئے بہانے کرکے ٹالتے ہو۔

جوگی:۔ اری میرے یوگ کو کھیل نہ سمجھ۔ بے وقوف چولا بدلنے میں کیا دیر لگتی ہے پر یہ تو سوچ کر رانی بنانے کے لیے کتنے جتن کرنے پڑیں گے کسی راجہ کو کہاں سے ڈھونڈ تا پھروں جو آکر تجھے لے جائے اور رانی بنائے۔

ہتھنی :۔ گروجی! ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔ بس کی بات نہیں تو ویسے کہہ دو۔ جوگی نے جو یہ طعن کی باتیں سنیں آنکھیں لال ہو گئیں..... کمنڈل پاس رکھا تھا چلو میں پانی لے چھینٹا مارا۔ ہتھنی زمین پر گری پھر جو اٹھتی ہے تو چودہ برس کی پریزاد۔

بی چوہیا کی خوشی کا تو ٹھکانا نہ تھا۔ جوگی جی بھی اپنی کرامت پر عش عش ہو گئے۔

چوہیا لڑکی بنی بھی تو ایسی حسین کہ آدمی دیکھا کرے جوگی نے اسے اچھے اچھے کپڑے بنا دئیے اچھے اچھے پھل مٹھائیاں لالا کر کھلاتا اور آٹھوں پہر اس کی خاطر میں لگا رہتا۔ اس نے اس کا نام " موسارانی " رکھا۔ لڑکی بھی جوگی کو اپنا گرو سمجھتی ہر وقت خدمت میں لگی رہتی۔ لیکن دل کے اندر رانی بننے کی آرزو تھی۔ سوچا کرتی کہ دیکھیے وہ دن کب آتا ہے کہ کوئی راجہ مجھے اپنے راج پاٹ کا مالک بنائے۔ ایک روز جوگی تو کہیں دور گیا ہوا تھا۔ موسارانی کٹیا کے دروازہ سے لگی بیٹھی تصور کی دنیا کا تماشا دیکھ رہی تھی کہ ایک نوجوان گھوڑے پر سوار سامنے آیا۔ رنگ روپ۔ چال ڈھال پاس آکر گھوڑے سے اتر پڑا۔ اس کی آنکھیں موسارانی پر گڑ گئیں۔ موسارانی کھڑی ہو گئی۔ غیر مرد سے شرما کر یا اکیلے ہونے کے سبب ڈر کر اور اپنی ساڑھی سنبھالتے ہوئے بولی " تم کون ہو۔ جوگی جی سے کوئی کام ہو تو ادھر سبیں کی چھایا میں بیٹھ جاؤ "۔

اجنبی :۔ سندری خفا نہ ہو۔ دیکھتی ہو کیسی دھوپ پڑ رہی ہے پیاسا ہوں۔ ہو سکے تو پانی پلا دو۔

موسارانی کو اجنبی کی آواز بھلی معلوم ہوئی۔ دھیان دے کر جو اس کی صورت دیکھی تو دھک سے رہ گئی یہ سوار وہی راجہ تھا جو اسے ہتھنی کے بن میں پکڑنے گیا

تھا۔ آنکھوں کے سامنے ہزاروں رنگ برنگ کے پھول کھلنے لگے۔ گھونگھٹ نکال جھکی
کے چرنوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "مہاراج! میں نے آپ کو جانا نہ تھا۔ آپ
میرے بولوں کا برا نہ مانیں"

راجہ :۔ اب کس طرح جانا؟

موسا رانی :۔ بھاگ کھلتے ہیں تو اپنے راجہ کو پہچانا جاتا ہے۔

راجہ :۔ تو کیا تمہارے بھاگ کھل گئے (مسکراتا ہے)

موسا رانی :۔ آپ کنڈی کھڑکائیں اور بھاگوں کی کنڈی بند رہے۔ پھر آپ یہ بار سنے
کیوں نہیں۔ میں ابھی پانی لاتی ہوں۔

موسا رانی پانی لائی۔ راجہ نے پیا۔ پانی کی پیاس تو بجھ گئی لیکن دل کی پیاس
کس طرح بجھے؟ یہ سوچ تھا۔ اس لئے کہ راجہ کی آنکھیں موسا رانی کے حسن کی دھوپ
میں برابر تلملا رہی تھیں۔ اس نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر پوچھا "اچھا تو اب
میں جاؤں" ؟

موسا رانی :۔ میں کیسے کہوں۔ آپ مالک ہیں۔ دیش کے کسی پہ ایک جوگی کی لڑکی کا
کیا زور؟

راجہ :۔ کیا تم سچ مچ جوگی کی بیٹی ہو۔ جوگی تو ان بکھیڑوں سے آزاد ہوتے ہیں۔

موسا رانی :۔ بھولے بھٹکے جیون کو پالنا تو ان کا کام ہے!

راجہ :۔ پھر تو تم جوگن نہیں بروگن ہو۔ تمہاری ذات؟

موسا رانی :۔ سنا ہے کہ میں کسی کشتری کی بیٹی ہوں۔

راجہ :۔ کس سے سنا؟

موسا رانی :۔ جوگی جی سے بڑے بھاگ کی کہانی سنی ہے جب انھوں نے سنائی تھی مجھ کو
رونا آگیا تھا۔

راجہ :۔ یاد ہو تو مجھے بھی سناؤ۔

موسارانی :۔ بپتا کی کتھا بسرا نہیں کرتی۔ پر تم سن کر کیا لوگے رونے کو جی چاہتا ہے

راجہ :۔ رونا آئے گا میں بھی رولوں گا۔ شاید اس بپتا میں پریم کی کوئی جھلک ہو اور یہ کہانی سپنا بن جائے۔

موسارانی :۔ نہ سنتے تو اچھا تھا..... خیر سنئے ان کا کہنا ہے کہ میرے پتا کوئی بڑے راجہ تھے گردش کا پھل اپنے دشمن ہو گئے۔ سماں بگڑ گیا چاروں طرف خون کے پیاسے تھے۔ ایک رات میری ماں کا ہاتھ پکڑ چپکے سے نکل کھڑے ہوئے۔ بیریوں سے چھپتے جان بچاتے اس جنگل میں بسیرا لیا۔ وہیں کہیں ڈاکو بھی چھپے تھے ان کی جو نظر میرے پتا کے چمکتے ہوئے مکٹ پر پڑی آنکھیں چندھیا گئیں چاروں طرف سے آپڑے ماتا کا سارا زیور اور پتا کی جان لوٹ کر لے گئے ماتا کے پیٹ میں میں تھا گئی تھی پتی کو جو سامنے دم توڑتے دیکھا۔ ایسا صدمہ ہوا کہ گر کر پھر نہ اٹھیں۔ ایسے وقت میں نے جنم لیا کہ دنیا کی ساری گودیں خالی ہو گئی تھیں۔ میری زندگی کا یہ سامان ہوا کہ درخت پر شہد کی مکھیوں نے چھتہ بنا رکھا تھا۔ اس میں سے شہد رسنے لگا۔ ہر بوند سیدھی میرے منہ میں ٹپکتی جوگی جی اپنے ہی کی آنکھوں سے یہ ناٹک دیکھ رہے تھے وہ مجھے اٹھا لائے اور پال پوس کر اتنا بڑا کیا۔

راجہ :۔ تمہاری صورت۔ تمہارا سبھاؤ۔ تمہارے شہد سے میٹھے شبد بتاتے ہیں کہ تم سچ مچ راج دلاری ہو۔

موسارانی :۔ (مسکرا کر) مہاراج غریبوں سے ٹھٹھول نہ کیجئے۔ اب تو اس کٹیا میں رہتی ہوں۔

راجہ :۔ جو بیتنی تھی بیت گئی ...... وہ دیکھو ایک راجہ کا محل تمہارا انتظار کر رہا ہے

موسارانی :۔ (نیچی نظر کر کے) ان داتا! جب اپنا ہی محل نہیں رہا تو پرائے محل کی

سپنا بھی نہیں دیکھنا چاہیئے۔

راجہ:- کنیا اپنے محل میں راج نہیں کیا کرتی۔ اس کے واسطے دوسرے ہی محل ہوا کرتے ہیں سمجھے

اتنے میں جوگی آگیا۔ دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر مسکرایا۔ راجہ نے اٹھ کر ڈنڈوت کی۔

جوگی:- بچہ! ادھر کیسے آنا ہوا؟

راجہ:- گرو جی! پیاسا تھا پر پیاس نہیں بجھی اور بھڑک اٹھی۔

جوگی:- یہ کیسے؟

راجہ:- پریم کی پیاس پانی سے نہیں بجھتی۔

جوگی:- راج دھنی مایا کے جال میں نہ پھنس۔

راجہ:- مہاراج! بالکل بے بس ہوں۔

جوگی:- راجہ ہو کر ایسی باتیں؟

راجہ:- اب تو مجھ پہ دیا کرنی ہی ہو گی (موسارانی کی طرف اشارہ کر کے) یہ پریم بھاگ مجھے اپنے راج محل میں لے جانے دیجئے۔

جوگی:- اس سے بیاہ رچاؤ گے؟ پر اس کا رن تو.... (کہتے کہتے رک کر) اچھا لے جاؤ...... جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ ہونے والی بات ہو کر رہے گی جسے تم پریم کا ساگر کہتے ہو اس میں سے پاپ کی دراریں بہیں گی۔ اچھا! پرماتما کی یہی اچھا ہے (موسارانی سے) جا۔ راجہ کے گھر میں رانی بن۔

یہ کہتا ہوا جوگی اپنی کٹیا میں چلا گیا۔ راجہ اپنی دھن میں ایسا مگن تھا کہ جوگی کی کوئی بات نہیں سنی اور سنی بھی ہو گی تو سمجھتا کون۔ قصہ مختصر راجہ موسارانی کو ساتھ لے خوشی خوشی اپنے محل میں آیا۔ بڑی دھوم سے شادی ہوئی۔ راج دربار میں اسی کا حکم چلنے لگا۔ ساری رانیاں دل سے اتر گئیں۔ موسارانی کے سامنے کوئی انھیں نہ پوچھتا

ایک چوہیا کے لئے ارتقا کی یہ آخری منزل تھی لیکن آرزوؤں کا سلسلہ ابھی باقی تھا خیالات رات دن ڈانوا ڈول رہتے تھے ایک رات چاندنی کھلی ہوئی تھی راجہ کو سوتا چھوڑ کر محل کے باغیچے میں ٹہلنے لگی پھرتے پھرتے کنوئیں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ دل میں آیا کہ کنوئیں کے پانی میں اپنی صورت دیکھوں۔ جگت پر چڑھ کر اندر جھانکنے لگیں چاند کا عکس تھرتھرا رہا تھا اس کے ہچکولے کھانے سے سر چکرایا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا پاؤں جو تھرکے تو دھڑام سے اندر۔ سارے محل میں قیامت آگئی راجہ سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زمین آسمان ایک کر دیا۔ رانی نکالی گئی مگر بیجان۔

رانی کی ارتھی سامنے رکھی تھی اور راجہ بچھوا ہاتھ میں لئے خودکشی پر آمادہ تھا۔ وزیر، امیر، رانیاں سب منتیں خوشامدیں کر رہے تھے کہ چوب دار نے عرض کیا۔ "مہاراج ایک جوگی حضور سے ملنا چاہتا ہے" راجہ کو جوگی سے ملنے کا ہوش کہاں تھا جو چوب دار کو جواب دیتا۔ اتنے میں دوسرا چوبدار آیا۔ "ان داتا جوگی کے لئے کیا حکم ہے" راجہ خاموش تھا کہ برابر سے ایک جوگی نکلا۔ راجہ صورت دیکھتے ہی جوگی کے پاؤں پر گر پڑا۔ "گرو جی دہائی ہے۔ پریم کا ساگر خشک ہو گیا" جوگی نے راجہ کو اٹھا کر گلے سے لگایا اور موسارانی کی لاش کو دیکھ کر راجہ سے کہنے لگا "بچہ! یہ بھی ایک بھان متی کا کھیل تھا ہو چکا۔ تقدیر سے لڑتا ہے۔ ایشور کی مرضی یہی تھی۔ ایک جوگی کے ہاتھ کا بیج بویا ہوا راجہ کے محل میں پہونچ گیا۔ یہ لکھا تھا سو ہوا۔

راجہ :- گرو جی! مجھے ڈھارس دو۔ مجھ سے رانی کی جدائی نہیں سہی جاتی۔

جوگی :- نادان وہ رانی نہیں تھی۔ انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا تھا۔

راجہ :- مہاراج آپ کیا کہتے ہیں۔

جوگی :- ارے وہ میرے غرور کا پھل تھی۔

راجہ :- کیا۔ کیا۔ آپ کے اس جوگ میں بجوگ؟

جوگی :۔ ذرچی نگاہ کر کے ! جوگ ! نہیں جوگ کا اپ مان !

راجہ :۔ ہے جگوان۔ اس چولے کا بھرم بھی گیا۔

جوگی :۔ راجہ ! وشواش رکھ۔ ست کا بھرم نہیں جایا کرتا۔

راجہ :۔ مہاتما۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کیا کہتے ہیں۔

جوگی :۔ بات یہ ہے کہ میری کٹیا میں کہیں سے ایک چوہیا آگئی۔ پھدکتی ہوئی اچھی لگی۔ دل میں آیا کہ اگر یہ آدمی کی طرح بولنے لگے تو کیا اچھا ہو۔ وہ بولنے لگی۔ میں چوک گیا بس پھر کیا تھا میں نے اپنی طاقت آزمائی شروع کر دی۔ چوہیا سے بلی۔ بلی سے کتیا۔ کتیا سے بندریا۔ بندریا سے سورنی۔ سورنی سے ہتھنی اور آخر میں ہتھنی سے آدمی بنا دیا پر یہ میری بھول تھی اور اس بھول کا بھگتان صرف مجھ کو ہی نہیں بلکہ سارے فقیروں کو بھگتنا پڑے گا۔ اب تو اس کو بھول جا۔ راج پاٹ پر دھیان دے۔

راجہ :۔ پر گرو جی۔ اس نے جو مجھ سے پریم کیا ہے اس کا بھی تو کوئی پھل ہونا چاہئیے۔

جوگی :۔ محبت کا پھل ! اچھا میں اس محبت کو امٹ بنا دیتا ہوں لاش کو کنوئیں میں ڈال کر پاٹ دو۔ اس کی خاک سے ایک ایسا درخت پیدا ہو گا جس کے پھل میں امرت اور زہر دونوں کی خاصیتیں ہوں گی۔

یہ کہہ کر جوگی تو چلا گیا۔ راجہ نے موہا رانی کو کنوئیں میں ڈال مٹی بھر دادی کچھ روز بعد کنوئیں پر ایک نرالی وضع کا پیڑ اگتا ہوا دکھائی دیا۔ پھر اس میں لال زرد اودے کئی رنگ کے پھول آئے اس کے بعد سبز سبز گیند نما پھل لگے لوگوں نے طرح طرح سے اس کا استعمال شروع کیا۔ آج نہ وہ راجہ ہے نہ جوگی نہ وہ رانی لیکن وہ درخت موجود ہے لالہ اس کا پھول ہے اور پوست پھل۔ افیون اسی پوست میں سے نکلتی ہے اب آپ پوست پینے والے اور افیمیوں کے اعمال و افعال اور ان کی پوزیشن ملاحظہ

کر لیں۔ چوہیا نے جن جانوروں کی صورتیں بدلی تھیں کسی نہ کسی کی دوا ضرور ہوگی پھر جس طرح محبت زہر بھی ہے اور امرت بھی۔ افیم بھی دوا سمجھو تو اکسیر ہے ورنہ قاتل۔

(از "آج کل" دہلی)

دعوت

توبہ! توبہ!! کل کا دن کس قدر منحوس تھا۔ کیسا خفیف ہوا ہوں دعوت تھی یا مصیبت! خالو ابا بھی سر ہی ہو گئے۔ آخر خود بھی شرمندہ ہوئے اور مجھ پر بھی لوگوں کو ہنسوایا۔ میں کہتا ہوں اب جو خالہ اماں میرے پالنے والوں کو کوس رہی ہیں اور بڑے میاں کو الگ بڑ لگی پڑی ہے اس سے کیا فائدہ؟ جو ہونا تھا ہو گیا وقت کی بات ہے۔ غصہ کریں میری بلا سے یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ مجھ پر کیا گزری جی چاہتا ہے کہ چلو بھر پانی میں ڈوب مروں وہاں مدرسے کے دو چار لڑکے بھی تھے کیا انھوں نے مجھے نہ دیکھا ہو گا وہ ایک شریر بات کا بتنگڑ بنانے والے چھیڑ چھیڑ کر تماشہ بنا لیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے پڑھنے لکھنے ہی کو استعفیٰ دینا پڑے لیکن خدا نے مجھے ایسا گاؤدی کیوں بنایا۔ گاؤں میں کیا سب ایسے ہی ہوتے ہیں ہاں میں کیا گاؤں میں نہیں رہتے سبحان بھیا بھی تو ہمارے ہی گاؤں کا لڑکا ہے کیسا چالاک، کتنا ہوشیار، دعوت میں ساری برادری اس کی تعریف کر رہی تھی۔

ایک میں ہی تھا کہ جو دیکھتا ہنستا باؤلا بنا لیا۔ بولا دیا۔

بھلا یہ بھی کوئی بھلمنسائی ہے اور اگر شہر کے یہی دستور ہیں تو شہر میں رہنے کو سلام۔ شہر والوں کا سا سلیقہ۔ ان کی سی ترت پھرت ہمیں نہیں آتی تو اس کے

یہ معنی ہیں کہ ہم پہ ہنسیں ہمارا مذاق اڑائیں خاصے اچھے بھلے آدمی کو لو بنائیں بھئی ان کی یہ باتیں ذرا پسند نہیں۔ اچھا تو ہوا کیا؟ ہوتا کیا، میرے سیدھے پن نے بس بوئے۔ خالہ اماں فرماتی ہیں کہ موا گنوار کا لٹھ بے گھمے بھنسیں چراتا شہر میں کیوں آیا؟" وہ جو کہیں بجا ہے نہ اماں مرتیں نہ میرے یہ دہاڑے ہوتے ان شہر والوں پہ آکر تھوکتا بھی نہیں۔ نصیب میں یہی لکھا تھا۔

کوئی مجھے کچھ ہی کہے، وہی مثل ہے کہ مارتے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے کہنے کی زبان نہیں پکڑی جاتی مگر میں تو یہی کہوں گا کہ اتنا احمق نہیں جتنا وہ سمجھتے ہیں ہاں ایک ذرا عقل کا کچا ہوں۔ شہر والوں جیسا بے بہاؤ نہیں۔ شہر کی مجھے ہوا ہی نہیں لگی میرا قصہ یہ ہے کہ میں ایک موروثی زمیندار کا بیٹا ہوں گھٹتے گھٹتے زمینداری کچھ زیادہ نہیں رہی تھی پھر بھی خاصی خوش حالی کے ساتھ گذارا ہوتا تھا ہمارے رشتے والے شہر میں بھی تھے۔ مگر روز روز کون آتا جاتا ہے اپنے کاروبار سے کسے فرصت کہ ادھر کا ادھر کا ادھر آئے جائے۔ میری والدہ شہر کی بیٹی تھیں۔ ہر چند انھوں نے چاہا کہ پہلا جاپا تو اپنوں میں ہو دادی کیا مانتیں وہ گھر کی بڑی بوڑھی ان کے آگے کس کی چلتی بہر حال میں وہیں گاؤں میں پیدا ہوا وہیں پلا بڑھا۔ کبھی چھوٹا سا شہر میں آیا ہوں گا۔ جب سے ہوش سنبھالا خدا بخشے اماں بی کے جیتے جی تو شہر کی صورت تک بھی نہیں دیکھی تھی۔

ہمارے خاندان میں نجانے کسی کی بددعا ہے یا کیا اولاد بہت کم ہوتی ہے اور ہوتی ہے تو جیتی مشکل سے ہے میں پیدا ہوا تو بڑی اشتر آمیں ہوئی۔ باپ آنکھوں کا تارا اور ماں کلیجے کی ٹھنڈک سمجھتی۔ کسی کے سامنے دودھ نہ پلاتیں کہ نظر نہ لگے۔ گھٹنیوں چلنے لگا تو جدھر میں جاتا وہ پیچھے پیچھے دوڑتیں۔ چلنے پھرنے کھیلنے کودنے کے قابل ہوا تو ابا جان آنکھوں میں رکھتے۔ اماں نظروں کے سامنے سے

نہ ہلنے دیتیں۔ گھر ہی کے اندر میرے کھیل کود کے سارے سامان تھے پڑوس کے دو چار بچے ہمارے ہی ہاں کھیلتے بہت ہوتا تو کبھی کبھی والد اپنے ساتھ کھیتوں کی سیر کرا لیتے شہر میں ایسی حالت ہو تو بچے ٹھٹھر کر رہ جائیں اور دن رات کسی نہ کسی روگ میں مبتلا رہیں۔ گاؤں کی بلا دور۔ میں ہتھیلی کا پھپھولا رہ کر بھی سنڈ مسنڈ ہوتا جاتا تھا۔ کھلے ہوئے میدان۔ تازہ ہوا۔ کنوؤں کا ٹھنڈا پانی۔ گھر کا اناج۔ اپنی چکی کا پسا ہوا آٹا گھی دودھ مکھن اچھا چھاچھ اتنی کہ بنی بنی پھرے۔ خوب کھاتا اور دندناتا۔ دس گیارہ برس کی عمر میں شہر کے جوانوں سے تگڑا ہو گیا۔ رہا البتہ سیدھا سادہ۔ کیوں نہ رہتا ماں باپ روادار ... بھی نہ تھے کہ چوپال تک جا کر بیٹھوں۔ گنوار سہی، پڑھے لکھے نہ سہی اپنے کاموں میں تو سب ہوشیار ہوتے ہیں لوگوں میں بیٹھتا۔ ان کی باتیں سنتا ہنستا بولتا اوروں کو بات چیت کرتے بھیڑ بھڑکا میں کھاتے پیتے دیکھتا اپنا بھی دل کھلتا ملنے جلنے بیٹھنے اٹھنے کی سمجھ آتی ہمارے گاؤں میں مدرسہ تو کیا ہوتا مسجد میں ایک ملاجی بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اس لئے نہیں کہ لکھ پڑھ کر ہشیار ہوں بلکہ اس لئے کہ انھیں اناج پانی کا زیادہ سہارا ملے۔ اول تو وہ نرے ملاجی ہی تھے۔ انھیں خود ہی کیا آتا تھا جو دوسروں کو سکھاتے۔ دوسرے اگر گاؤں والے شہر والوں کی طرح لکھے پڑھے ہونے لگتے تو ان کی دال کب گلتی وہ روز دونوں وقت باری باری ایک ایک گھر پر جاتے روٹی بھی لاتے اور بچوں کو بھی ٹٹولتے رہتے۔ ایک دن جو ہمارے گھر آئے تو مجھ کو درخت کے ایک گدّے پر بیٹھا دیکھا تو میاں سے کہنے لگے "خانجی لونڈے کو کچھ پڑھاؤ لکھاؤ گے نہیں؟"

والد:۔ ملاجی! ابھی تو اس کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں پڑھنے بٹھا کر کیا میں اس کی اٹھان کا ستیاناس کر دوں۔

ملاجی:۔ مسجد میں بھیجنا تو شروع کرو۔ جب تک جی چاہے بیٹھے جب دل

چاہے چلا آئے۔ اللہ رسول کو تو پہچاننے لگے گا۔

ملاجی کا اثر تھا پاس پڑوس والوں نے بھی کہا سنا والد راضی ہو گئے اور دوسرے دن سے مسجد میں جانے لگا ایسے مکتبوں میں پڑھنا کیا ہوتا ہے؟ کتاب آگے رکھ لی اور ہلے جاؤ یا جو ملاجی کے منہ سے نکلے دو غل مچا مچا کر کہتے رہو۔ مہینوں اسی طرح گذر گئے خدا خدا کر کے بغدادی قاعدہ ختم ہوا۔ سیپارہ شروع کیا مٹھائی بٹی ملاجی کو جوڑا دیا گیا اماں نہال نہال کہ اب بچہ حافظ بنا۔ محلے کی عورتیں مبارک باد کو آئیں۔ میرا ذہن اچھا تھا جو پڑھنا طوطے کی طرح یاد کر لیتا مگر پہلے سیپارہ کے بعد نہ دوسرا ملاجی پڑھا سکتے تھے نہ مجھ میں اتنی استعداد پیدا ہوئی تھی کہ اپنے آپ آگے چلتا۔ اردو کی پہلی شروع کی۔ تختی لکھنے کی نوبت آئی۔ ملاؤں کو جیسا لکھنا آتا ہے سب جانتے ہیں۔ بہرحال کئی سال یوں ہی میاں مٹھو بنا ہوا بنی جی بھنبھنا رہا۔ بشکل اتنا ہوا کہ اٹک اٹک کر کچھ پڑھ لیتا اور کیڑے مکوڑے بنا لیتا۔

اللہ میاں کی بے نیازی دیکھئے عین گرمیاں میں غلہ پڑا۔ ایکا ایکی سارستی آ گئی ادھر تو کھیتی فصلیں بارش نہ ہونے سے ماری گئیں۔ بنیوں سے قرض لے لے کر کھانا پڑا۔ ادھر شہر میں جو طاعون پڑا تو وہاں سے لوگ نکل نکل کر گاؤں میں آنے لگے پٹواری کا کہنا ہماری بستی میں کیا آیا کہ وہاں بھی چٹاپٹی کا بازار لگ گیا۔ یہ مرا وہ مرا اور تو خیر جن کو مرنا تھا مرتے ہی میری والدہ بھی چل بسیں۔ ہم تین دم تو تھے ہی۔ گھر والی سے گھر ہوتا ہے وہی نہ رہیں تو ہمارا کہاں ٹھکانا تھا۔ چولھا ٹھنڈا رہا۔ سارے آرام رخصت

بیماری تو ایک طوفان تھا آیا اور مرنے والوں کو سمیٹ سماٹ چلا گیا۔ اب ہم کیا کرتے؟ میرا روتے روتے برا حال۔ ابا مجھ کو سنبھالتے۔ قرض اتارنے کی فکر کرتے یا ردیاں تھوپتے۔ یہ صلاح ہوئی کہ مجھے شہر میں خالہ کے پاس چھوڑ دیں۔ میر بھی ادل بدل ہو جائے گا اور وہ بھی فراغت کے ساتھ اپنی کھیتی باڑی کی دھندا کریں گے۔ چنانچہ

ہم دونوں باپ بیٹے چھکڑے پر لد کر شہر آئے۔ خالہ نے مجھے اپنی موئی بہن کی نشانی سمجھ کر چھاتی سے لگا لیا اور اب میں گاؤں سے شہر میں آ گیا۔

خالو ابا بے چارے کہیں نوکر نہیں تھے چاکر نہیں تھے۔ ان کی پرچون کی چھوٹی سی دوکان تھی مگر تھے بڑے حوصلے والے۔ دوسرے کوئی لڑکا بالا بھی نہ تھا۔ میں کیا آیا ان کے گھر میں رونق آ گئی۔ بہت خوش ہوئے۔ حد سے زیادہ میری دلداری کرتے۔ میرے کھانے پینے کا خیال رکھتے۔ تاہم میری گنواری عادتوں کو کیا کرتے۔ بات کرنی مجھے نہیں آتی تھی۔ اٹھنا بیٹھنا میرا بے ڈھنگا تھا۔ لوگ کہتے ہیں میں تو نہیں جانتا۔ میں تو بس اتنا سمجھتا ہوں کہ شہر والوں کے طریقے مجھے نہیں آتے تھے۔ خالہ کسی کام کو خالو ابا کے پاس بھیجتیں تو منہ سے پوری بات نہ نکلتی۔ کوئی چیز بازار سے منگواتیں تو جب دوکان دار دیتا لے آتا۔ اچھے برے کی تمیز نہ ہوتی۔ وہ دوکان پر بیٹھنے کو کہتے تو پیٹھ موڑ کر بیٹھ جاتا۔ ان کے لینے والے کچھ پوچھتے تو شرم آ جاتی۔

میری یہ کیفیت دیکھ کر ایک دن خالو ابا خالہ اماں سے کہنے لگے کہ "دیکھنا یہ تمہارا بچہ تو بالکل ہی لٹھ ہے۔ بات تک کرنی نہیں آتی۔ اتنا بڑا ڈھینگ اور کسی سے چار آنکھیں نہ کر سکے اس سے تو شہر کے بچوں کو بھی مات کر دیا۔"

خالہ:۔ چلو تم ٹوکو تو نہیں۔ شرمیلا ہونا کوئی بری بات ہے۔ ابھی اسے یہاں آئے ہوئے دن ہی کے ہوئے ہیں دو چار۔ جیتے رہے گا تو سب سے گھل مل جائے گا۔

خالو:۔ میں کہتا ہوں کہ اب یہ ہمارے پاس آ گیا ہے ہمیں اسے آدمی بنانا چاہیے اگر مودھو کا مودھو ہی رہا تو شہر میں رہنے سے کیا فائدہ۔ کھلانے پہنانے کو کوئی نہیں دیکھتا۔ سب ہمیں ہی کہیں گے اور بھائی شکر اللہ کی جدا شکایت

رہے گی کہ خالو نے خوب اٹھایا۔ نہ کوئی ہنر سکھایا نہ آدمی بنایا۔

خالہ:۔ اچھا تو تمہارا مطلب کیا ہے؟

خالو:۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں اسے کل سے مدرسہ میں بٹھا دیتا ہوں۔ خدا کو منظور ہے اور اس نے کچھ لکھ پڑھ لیا تو کہیں نوکر چاکر ہو جائے گا۔ کیونکہ کھیتی باڑی تو اب اس کے بس کی رہی نہیں اور کچھ نہیں تو ہوشیار ہونے کے بعد کوئی دوکان ہی کرا دونگا ذرا حساب کتاب کرنے کے قابل تو ہو جائے۔

خالہ:۔ اے نیکی اور پوچھ پوچھ۔ کس نے منع کیا ہے شوق سے پڑھنے بٹھا دو۔

چلئے میں دوسرے ہی روز کمیٹی کے مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ اب میری دنیا دوسری تھی۔ مدرسہ کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا۔ اتنا بڑا مکان۔ اتنے بہت سے لڑکے ماسٹر بنے ٹھنے کوئی گدی بچھائے بیٹھا ہے تو کوئی کرسی میز لگائے چپراسی نوکر ہیں۔ باہر خوانچہ والے ایک آتو چھولے بیچ رہا ہے تو دوسرا کچالو کی چاٹ دہی بڑے۔ سونٹھ کا پانی، بتاشے ایک بہار تھی۔ گاؤں میں ایسا میلا بھی نہیں ہوتا۔ چھوکرا تھا ایسی چہل پہل میں دل کیوں نہ لگتا۔ لیکن شرم کا کیا علاج؟ سر نیچی نگاہ سے سب کو دیکھتا اور الگ بیٹھا رہتا۔ اگر بیٹھنا ہی تھا۔ گاؤں دیکھا تھا یا ملاجی کی مسجد۔ ملاجی بیچارے کا سر گھٹا ہوا لمبی ڈاڑھی نیلا تہمد۔ گاڑھے کی مرزئی۔ سر پہ دوسوتی کا صافہ۔ لڑکے بھی گنتی کے دو چار نہ سہی دس بارہ ہی اور سب جانے بوجھے کوئی ٹانگوں سے ننگا تو کوئی گلے سے۔ کھیل بھی ان کے وہی گنوارو۔ ہنسنا بولنا بھی سب کا ایک قسم کا یہاں استاد ڈاڑھی منڈے سر پہ دھاگا تک نہیں۔ لڑکے اُجلے ہندو ہے تو دھوتی باندھے مسلمان ہے تو پاجامہ پہنے کسی کے سر پہ ترکی ٹوپی ہے تو کسی کے سر پہ گاندھی کیپ۔ بعض لاڈلے انگریزی ٹوپ بھی لگائے ہوئے تھے۔ بستے بھی وضع وضع کے کسی کے کندھے پہ ڈاکیوں کا تھیلا لٹکا ہوا ہے تو کوئی بہیروں کا سا جال پیٹھ پہ ڈالے چلا آتا ہے۔ کھیل بھی ان

سے نئے نئے۔ ان کی میری بولی میں بڑا فرق۔ میں دیہاتی وہ شہری۔ میرا ان کا میل جول
کیا ہوتا۔ ان کے ساتھ کھیلنے کودنے، بات چیت کرنے کو جی چاہتا لیکن جھجک کے
مارے دور ہی دور سے بیٹھا ہوا خوش ہوا کرتا۔

کتابیں آگئیں اور پڑھائی شروع ہوئی تو ایک اور نئی مصیبت کا سامنا ہوا جب میں
پڑھتا یا کچھ بات کرتا تو لڑکے ہنستے۔ میں گاؤں کا رہنے والا بھاری آواز دندانے دار
بولی جھٹکے دے دے کر پڑھوں۔ ماسٹر جی بہتیرا ڈانٹتے۔ بہت کو اپنے ڈسک پر پیٹتے
لیکن لڑکے ہنسے بغیر کیا مانتے۔ لڑکے تو لڑکے بعض دفعہ تو وہ خود بھی مسکرانے لگتے پھر
اگر استاد کے ڈر سے جماعت میں کوئی نہ ہنستا تو تفریح کے گھنٹہ میں یا چھٹی کے بعد میری
نقلیں ہوتیں۔ قہقہے اڑتے۔ چھیڑ چھیڑ کر سب مجھے دبا جاتا۔ کوئی کہتا کیوں جی تم روٹی کتنی کھاتے
ہو۔ کوئی پوچھتا۔ چودھری...... تمہاری کھیتی میں ہونٹیں بھی ہوتی ہیں۔ کسی نے
میرا نام شتر رکھا تھا کسی نے چیل کا انڈا۔ میں سب کی سنتا اور کھسیانا ہو ہو کر رہ جاتا
نہ ماسٹر جی سے شکایت کرتا نہ گھر میں آکر کہتا۔

ماسٹر جی ہر وقت میری زبان کو ٹوکتے رہتے ہر لفظ کو بول کر بتاتے اور کوشش
کرتے کہ میرا لب و لہجہ درست ہو مگر یہ الٹی بولی کہیں چھوٹتی ہے لاکھ جتن کرتا شین
قاف پر قابو ہی نہ رہتا جو لفظ زبان سے نکلتا مشدد۔ آخر میں نے قسم کھائی کہ کچھ ہی
ہو تشدید کو بھلا ہی دینا چاہیے۔ آدمی دل میں ٹھان لے تو پھر کیا نہیں کر سکتا میں
نے اب ہر لفظ بے تشدید کے بولنا شروع کیا۔ قسمت کی بات یہ بولی بھی پکڑی جانے لگی۔
شہر والوں سے خدا بچائے۔ کتاب پڑھنے کھڑا ہوا کسی کا سبق تھا بھٹے کو بھٹا بے تشدید
پڑھا چٹے کا لفظ آیا اسے بھی چٹہ کہا پھر گئی کو بڑے تکلف کے ساتھ گی منہ سے نکالا لونڈوں
کی شرارت دیکھو کہ ہنسی کے مارے لوٹنے لگے ماسٹر جی نے منہ پر رومال رکھ لیا۔ کوئی
پوچھے کہ اس میں کیا ہنسی کی بات تھی۔

افسوس تو مجھے یہ رہا اور ساری عمر رہے گا کہ میری ہمت کو کسی نے نہیں سراہا۔ اتنی اتنی ہنسی اڑی لڑکوں نے کیسی کیسی پھبتیاں کہیں۔ کیا مجال کہ نیچی نگاہ سے اونچی ہوگئی ہو۔ کوئی کہہ تو دے کہ ایک دن بھی مدرسہ جانے سے جان چرائی۔ بلا ناغہ جاتا رہا۔ لیکن اسی اثنا میں خالو ابا نے جو ظلم توڑا ہے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ کلیجہ پر داغ پڑ گیا کیا کہوں وہی مثل ہے کہ کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باپ کتا کھائے۔ کہتا ہوں تو سب ہنسیں گے اور بن کہے بھی بن نہیں آتی۔ بات یہ ہوئی کہ خالو ابا یوں تو معمولی پرچونئے ہیں۔ ایک آٹا دال بیچنے والے کی آبرو ہی کیا مگر ان کا رکھ رکھاؤ، ملنساری اور دوکان کی ساکھ ایسی ہے کہ اچھے اچھے گھرانے والے انھیں معقول سمجھتے ہیں۔ سچ بولنا، چھان پھٹک کر جنسیں رکھنا۔ پورا تولنا۔ میٹھی زبان، نرخوں میں کمی۔ دوکاندار کے لئے اور کیا چاہیے؟ محلے پر محلے ان کی شہرت، دور دور سے گاہک آتے اور آنکھ بند کر کے سودا لے جاتے۔ شہر کی ساری برادریوں میں رسائی جہاں دیکھو میاں بلاقی موجود۔ شادی غمی کی کوئی تقریب ایسی نہ ہوتی کہ ان کا بلاوا نہ آتا۔ بلکہ کھانا پکوانا، براتوں کو کھلانا۔ دعوتوں کا انتظام ان کے سپرد ہوتا اور ہر جگہ ان کی واہ واہ ہوتی۔

جب سے میں شہر آیا تھا کئی جگہ سے بلاوے آئے اور انھوں نے اپنے ساتھ مجھے بھی لے جانا چاہا کہ شہر کے لوگوں کو دیکھے گا ان کی باتیں سننے میں آئیں گی۔۔۔۔ باورچی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھائے گا۔ کبھی تو خالہ اماں نے کوئی بات بنا کر ٹال دیا کبھی میں نے بہانہ کر لیا۔ مجھے شرم آتی تھی کہ سینکڑوں آدمیوں میں کیوں کر کھایا جائے گا۔ مدرسہ کے لونڈوں نے تو میری یہ مٹی پلید کر رکھی ہے بڑے نجانے میری باتوں پہ مجھے کیا کہیں جتنا بچ گیا بچا۔ آخر بکرے کی ماں کب تک خیر منائی۔ ایک مرتبہ کہیں سے دعوت کا بلاوا آیا دعوت کرنے والوں کی تاکید تھی کہ لڑکے کو ضرور لانا پھر خالو ابا بھی یہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ آیا جایا کروں۔ دعوت کا دن آیا تو

انھوں نے دوکان جاتے ہوئے مجھ سے کہا:۔

"میاں شبّو! بھیا رمضانی کے ہاں دعوت ہے تم بھی چلنا۔"

میں :۔ خالو ابا! میرا تو جی نہیں چاہتا۔

خالہ :۔ اے ہے اب اسے کہاں لے جاؤگے اس سے تو مارے شرم کے نوالہ تک نہیں ٹوٹے گا۔

خالو :۔ اس کی یہ شرم ہی تو توڑنی ہے۔ آخر کبھی چار آدمیوں میں بیٹھنے اٹھنے کے قابل بھی ہوگا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ اسی طرح آنے کی آپا بنا رہے۔

خالہ :۔ آج اس کا جی نہیں چاہتا پھر سہی۔

خالو :۔ پھر سہی کیا؟ تم نے اسے اور بھی چھوئی موئی کا درخت بنا دیا ہے میں پوچھتا ہوں کہ دنیا میں اسے گذارہ کرنا ہے یا نہیں؟

خالہ :۔ وقت پر سب ہو جاتا ہے۔

خالو :۔ کیا اوندھی عقل کی عورت ہو۔ نیک بخت دنیاداری کے طور طریق ابھی سے نہ سیکھے گا تو کیا بڑھاپے میں سیکھے گا۔ اس عمر میں جب یہ حال ہے تو آگے کیا امید ہو سکتی ہے۔ دنیا میں کٹ کھنے اور بے میل آدمی کو کون پوچھے ملنے سے ملتا ہے اگر ہم کہیں نہیں جائیں گے تو ہمارے ہاں کوئی آکر جی نہیں تھوکے گا۔

خالہ :۔ تو تمہارا کون مزاحم۔ جاؤ جم جم جاؤ۔

خالو :۔ تمہاری سمجھ کہیں چرنے تو نہیں چلی گئی۔ ارے اب یہ جوان ہونے کو آیا۔ کوئی دن جاتا ہے کہ تم اس کے بیاہ کی فکر کروگی۔

خالہ :۔ کوئی دن کیسا؟ میں تو ابھی سے ٹٹول رہی ہوں میری مرضی کی لڑکی مل جائے تو کل لے آؤں۔

خالو :۔ تو کیا اسی طرح تمہیں لڑکی مل جائے گی۔ کون ایسا آنکھوں کا اندھا ہے کہ لڑکے

کو بے دیکھے اس کے چال چلن کو پرکھے بغیر بیٹی دے دے گا۔

خالہ:۔ لو اور سنو۔ میرے ننّو میں خدانخواستہ کوئی عیب ہے۔

خالو:۔ تم نہیں سمجھتیں۔ میرے ساتھ محفلوں میں جایا آیا کرے گا۔ لوگ دیکھیں گے میں اپنے دوستوں سے ملاؤں گا یونہی نسبت ناتے بھی ہو جاتے ہیں۔

خالہ:۔ مردوں کی سمجھ کو ہم عورتیں کہاں پہنچتی ہیں۔ مگر اس نگوڑے کو تو بات تک کرنی نہیں آتی۔

خالو:۔ کہیں آئے جائے گا نہیں ملنے جلنے سے بھاگے گا تو بات کرنی کہاں سے آئے گی۔

خالہ:۔ اچھا تو بسم اللہ کرو (مجھ سے) میاں! اپنے خالو آبا کے ساتھ ساتھ رہنا (میاں سے) اسے اکیلا نہ چھوڑنا اور رستے میں سلام کرنے ہاتھ ملانے اور بات چیت کے سارے قاعدے بتا دینا۔

یوں تو شاید میں رضامند نہ ہوتا شادی کا نام جو آیا دل میں لڈو سے پھوٹنے لگے نیچی گردن کر کے چپ ہو گیا' الخاموشی نیم رضا' خالو آبا چلتے چلتے تاکید کر گئے کہ "نہا دھو کر عید کو جو کپڑے بنائے تھے وہ پہننا اور بارہ بجے تک دکان پر آجانا پھر وہاں سے دعوت میں چلیں گے۔" وہ باہر گئے خالہ گھر کے دھندے سے لگیں اور میں یا تو مدرسہ کا کام کرنے بیٹھ رہتا تھا اتوار کی چھٹی تھی۔ ماسٹروں کو نہ جانے یہ کیا مار ہے کہ چھٹی کے دن بھی خالی نہیں بیٹھنے دیتے یہ سبق یاد کرنا اتنے سوال نکالنا نقشہ بنانا اور کچھ نہیں ڈسٹی کے آم' امرود' نارنگیاں ہی بنالانا گویا لڑکوں کو کمہار کا پیشہ کرنا ہے ہاں تو میں نے اپنا بستہ ابھی کھولا ہی تھا کہ دعوت میرے پیچھے پڑ گئی اور دعوت نے شادی کی تقریب پیدا کر دی۔ اب بستہ کیا کھلتا۔ طرح طرح کے خیالات دماغ میں آنے لگے گھڑی اچھے گھڑی برے کبھی سوچتا کہ یا اللہ میں کیوں کر ادتے

آدمیوں میں بیٹھوں گا۔ دعوت میں لوگ کس طرح کھاتے ہیں۔ بہت سی چیزیں ہونگی پہلے کونسی چیز کھانی چاہیئے؟ کم کھاؤں یا زیادہ؟ جلدی جلدی کھاؤں یا آہستہ آہستہ؟ اور اگر نوالہ حلق میں اٹک گیا یا اُچھو ہو گیا تو کیا گذرے گی خالہ تو وہاں ہوں گی نہیں کہ جھٹ گدی پر مکا ماریں یا پانی کا کٹورا دیں۔ اس تصور نے مجھے پریشان کر دیا شادی دولہا بنے اور دلہن بیاہ کر لانے کی پرچاس نہ ہوتی تو میں سون کھینچ جاتا۔ خالہ بگڑتیں یا خالو خفا ہوتے۔ بلا سے ہوتے۔ اس شوق میں جو شامت آئی وہ تو نہ آتی۔

اسی ادھیڑ بن میں وقت گذرتا چلا گیا۔ جاڑے کے دن جاتے معلوم نہیں ہوتے۔ ذرا سی دیر میں گیارہ بج گئے وہ تو خالہ اماں کو خیال تھا۔ انھوں نے باورچی خانہ میں سے آواز دی۔ "شبو! ارے او شبو!! دعوت میں جانا ہے یا نہیں۔ گیارہ بجے ہیں خالو راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ بیٹا جلدی سے نہا کر کپڑے بدل لے۔ پانی گرم ہو گیا ہے "۔

میں "اچھا ابھی آتا ہوں" کہتا ہوا اٹھا۔ چولھے پر سے گرم پانی کی گھڑیالی غسل خانہ میں گیا۔ جوں توں دو چار لوٹے پانی کے بہائے بدن کچھ پونچھا کچھ نہ پونچھا یوں ہی کپڑے پہن لیے گھبراہٹ میں الٹے سیدھے کا بھی دھیان نہ رہا۔ پاجامہ پہنا تو الٹا۔ اچکن پہنی تو استر اوپر اور ابرا نیچے جیبیں باہر لٹکی ہوئی۔ خالہ چولھا پھونکنے میں مصروف تھیں۔ دیکھتیں تو ٹوکتیں۔ خیلا بانکا دولہا بنا ہوا اسی حالت میں دوکان پر پہنچا۔ خالو جان دوکان اٹھا رہے تھے ان کی نگاہ جو مجھ پر پڑی تو کہنے لگے "میاں اچکن تو خوب پہنی ہے! بٹن تو لگا لو"۔ اب جو دیکھتا ہوں تو الٹی۔ شرم کے مارے پسینہ آ گیا۔ سیدھی کرنے کو جو اچکن اتاری تو ان کی نظر پاجامہ پر گئی۔ خفا ہو کر بولے شبو! تمہیں کبھی آدمیت بھی آئے گی؟ اتنے دن شہر میں رہتے ہو گئے الٹے سیدھے کی خبر نہیں وہی مثل ہے کہ بارہ برس دلی میں رہے اور بھاڑ ہی جھونکا۔ ہاتھ پاؤں

دیکھ، تو ڈھوکے ڈھو اور عقل ذرہ برابر نہیں۔ یہ میری لنگی لو اور دوکان کے اندر جاکر پاجامہ سیدھا کرکے پہنو۔ خدا نے بڑی خیر کی کہ میں نے یہیں دیکھ لیا۔ اگر اسی حالت میں دعوت والوں کے ہاں چلے جاتے تو لوگ کیا کہتے ؟ تم پر اور مجھ پر دونوں پر ہنستے

وہ برا بھلا کہہ رہے تھے اور مجھ پر گھڑے پر گھڑے پانی پڑ رہا تھا۔ جی میں آئی کہ یا تو کسی کنوئیں میں کود پڑوں یا سیدھا اپنے گاؤں جاکر دم لوں۔ بھلا یہ بھی کوئی خطا تھی۔ ننگا تو نہ تھا۔ سیدھا نہ پہنا الٹا پہنا آدمی سے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے اس میں شرمندہ کرنے کی کونسی بات ہے۔ لیکن شہر والوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے ان کی رسموں کے خلاف کوئی بات ہوئی اور وہ ہنسے۔ مذاق اڑایا۔ بنانا شروع کردیا۔ اچھا کیا کرتا۔ آن پھنسے کا سودا تھا۔ خدا کسی کو کسی کے بس میں نہ ڈالے۔ قہر درویش بجان درویش۔ دوکان کے اندر گیا۔ پاجامہ سیدھا کرکے پہنا اور چاروناچار ان کے ساتھ دعوت میں چلا۔ سارے راستے وہ وعظ کہتے رہے کہ یوں بیٹھنا یوں اٹھنا اسطرح سلام کرنا۔ ملنے کا یہ قاعدہ ہے کھانے پینے کے یہ طریقے۔ کوئی یہ پوچھے تو تم یہ کہنا وغیرہ وغیرہ میں اپنی ہی دھن میں تھا ان کی نصیحتیں خاک دماغ میں بیٹھتیں۔

خدا خدا کرکے دعوت کا گھر آیا۔ اندر گئے تو سارا مکان دعوتیوں سے بھرا ہوا۔ کمرے، دالان، آنگن ہر جگہ آدمی ہی آدمی۔ بڈھے، جوان، لڑکے لڑکیاں۔ الگ الگ ٹولیاں بنائے بیٹھے ہیں اندر گھسے ہی تھے کہ ڈیوڑھی کے برابر والے کمرے میں سے آواز آئی۔ "شیخ جی ادھر آؤ۔ بھئی بڑی راہ دکھائی۔ چلو دستر خوان بچھاؤ۔ بارہ بجنے والے ہیں۔" کمرے میں دس بارہ آدمی بیٹھے تھے خالو ابا نے جھانک کر دیکھا۔ اخاہ! کرخندار بھی ہیں میں تم کو ہی دیکھ رہا تھا (مجھ سے) میاں چچا کو سلام کرو (کرخندار سے) لینا اس کا ذرا خیال رکھنا۔ دستر خوان بچھے تو اپنے ساتھ بٹھا لینا۔" کرخندار نے میرا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچتے ہوئے کہا "سر آنکھوں سے تمہارے سارڈھو کا بیٹا ہے نا۔ ماشاءاللہ

ماشاءاللہ۔ اللہ عمر دے بڑا ہونہار جوان ہوگا۔ گاؤں کا پانی ہی ایسا ہوتا ہے۔

خالو:- میاں شبو گھبرانا نہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہو چپکے سے کہہ دینا۔ میں جب فارغ ہو کر جانے لگوں گا تو تمہیں اپنے ساتھ لے لوں گا۔

کرخندار:- گھبرانے کی کیا بات ہے۔ ہم جو سب یہاں موجود ہیں جیسے آپ کا بچہ ویسے ہمارا بچہ۔ آپ بے فکری سے اپنے کام سے لگیے۔

خالو جان تو دیگوں کے پاس جا کر کھانا نکلوانے اور دعوتیوں کو نمٹانے میں لگے۔ میں کمرہ میں بیٹھ گیا یہ کمرہ جس میں ہم بیٹھے تھے گھر والے کے لڑکے کا تھا طاق پر دو چار انگریزی کی کتابیں رکھی تھیں۔ میری نظر بار باران کتابوں پر جاتی میں سمجھا کہ تصویروں کا البم ہے اتنے میں کرخندار اور ان کے ساتھ اور آدمی بھی اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اب میں اکیلا وہاں رہ گیا یا دو بڈھے اونگھ رہے تھے تصویریں دیکھنے کا شوق چرایا۔ جلدی سے کھڑے ہو کر ایک کتاب اٹھائی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ شہر والوں کی کتابیں بھی اچھلتی کودتی ہیں۔ کتاب کا اٹھانا تھا کہ دوسری کتابیں نیچے آرہیں ان کے اوپر قلم دان رکھا تھا وہ بھی گرا۔ دوات اجلی سفید چاندنی پر اوندھ گئی تصویروں کا دیکھنا دکھانا تو ایسی تیسی میں گیا۔ مجھے یہ فکر ہوئی کہ لوگ آگئے تو کیا کہیں گے اور تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں جیب میں سے رومال نکال سیاہی پونچھی اور رومال پھر جیب میں رکھ لیا۔ کتابیں قلم دان اٹھا کر طاق پر رکھ دیا۔ فرش پر دھبا تو رہا مگر گیلا پن تو کم ہو گیا۔

خیر یہ ہوئی کہ پھر اس کمرہ میں کوئی نہیں آیا۔ لوگ کھا کھا کر چلے جاتے تھے ایک دسترخوان اٹھتے ہی جب دوسرا بچھا تو کرخندار نے باہر ہی سے مجھے بلوایا اور اپنے برابر میں کھانے پر بٹھا لیا۔ پہلے خمیری روٹیاں رکھی گئیں۔ پھر قورمہ کی رکابیاں آنی شروع ہوئی۔ اتفاق سے میرے آگے جو رکابی آئی اس میں کوئی چیز گول گول بڑی دکھائی دی۔ میں نے جانا کہ بکری کی مینگنی ہے رکابی اٹھا کر انگلی سے نکالنا چاہا رکابی گرم تھی

کنارے چکنے ہاتھ سے پھسل کر دسترخوان پر گری۔ سالن کی ساری چھینٹیں مجھ پر آئیں۔ اچکن کے دامن، کرتا، پاجامہ سب لت پت۔ مجھ کو رونکھا سا دیکھ کر کرخندار نے کہا۔ میاں ایسا ہو ہی جاتا ہے کچھ ڈر نہیں لانا بھئی دوسری "پلیٹ" اور بھی آس پاس کے لوگوں میں کوئی کچھ بولا کوئی کچھ بات آئی گئی ہوئی۔

کھانا سب کے آگے آچکا تو بسم اللہ چھوٹی۔ نوالہ پر نوالہ چل رہا تھا۔ کوئی بے ریشہ بوٹی مانگتا، کوئی گرم روٹی کھلانے والے چاروں طرف، پتیلیوں، بادیوں میں سالن لیے ایک ایک کو دیتے پھرتے تھے۔ میں جھینپو، مجھ سے کیا کھایا جاتا۔ ابھی آدھی روٹی بھی نہیں کھائی تھی کہ بے دھیانی میں اپنی عادت کے موافق تار میں خوب ڈبو کر ایک بڑا سا نوالہ منہ میں رکھ لیا ادھر تو نوالہ منہ میں رکھا اور ادھر پیچھے سے کھانا کھلانے والوں میں کسی کا دھکا لگا۔ اچھو ہو گیا۔ مرچیں دماغ کو چڑھ گئیں نوالہ منہ کا منہ میں چہرہ لال، آنکھوں میں آنسو۔ اشارے سے پانی مانگا کہ کہیں نوالہ تو حلق سے اترے گلے کا پھندا تو نکلے۔ آب خورہ لے کر منہ کو لگایا تھا کہ کمبخت چھینک آگئی۔ نوالہ تو نوالہ ناک تک نکل پڑی ہاتھ منہ اچکن کی آستین سب چپا بیا۔ آب خورہ ہاتھ سے چھٹ کر رکابی میں گرا۔ پانی کی چھینٹیں دوسروں پر گئیں۔ روٹیاں بھیگیں۔ سالن کی رکابیوں میں شوربہ بڑھا بعض جھلائے بعض مسکرائے دو چار نے پھبتیاں اڑانی شروع کیں کہ ذرا صاحبزادے کا منہ دیکھنا جیسے چوراہے کی کٹھیا" میاں کرخندار یہ جنگلی کہاں سے پکڑ لائے۔ تمیز نہ دارد گند ہوا، ارے بھئی کبھی اس نے کھایا بھی ہو۔ عجب صورت حرام لڑکا ہے منہ پر قابو نہیں تو . . . . . . پر کیا ہو گا ۔

محفل میں جس کو دیکھو وہ ہنس رہا ہے۔ شہر والے اللہ کی پناہ ہمدردی کا نام نہیں اپنے مذاق سے کام کسی کی جان پر بنے ان کا تماشا ٹھہرے۔ یہ تو ہوا۔ اب جو میری شامت آئی ہے تو پہلے میں نے اچکن کی آستین سے منہ پونچھنا چاہا جو

خیال آیا کہ سیاہی اچھی خراب ہو جائے گی۔ جیب سے رومال نکال کر آنسو، ماتھے کا پسینہ ناک منہ خوب رگڑ رگڑ کر پونچھا۔ رومال تھا سیاہی میں لتھڑا ہوا اور سیاہی نیلی۔ بیچارے کی شکل بن گئی۔ لوگوں نے قہقہے مارے۔ لڑکوں نے تالیاں بجائیں۔ حیران کہ انھیں کیا ہو گیا۔ ایک ایک کی صورت دیکھتا اور رہ جاتا۔ اتنے میں کرخندار بولے برخوردار یہ کیسا رومال تھا سارا منہ نیلا ہو گیا۔ دھیان آیا کہ افوہ رومال سے تو کمبخت سیاہی پونچھی تھی۔ ہاتھ دیکھتا ہوں تو وہ بھی نیلے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ لعنت ایسی دعوت پر۔ بھلا ایسی حالت میں وہاں ٹھیر سکتا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، جوتیاں اٹھا لگا چلا۔ گرتا پڑتا بے تحاشا بھاگا۔ کرخندار نے بہتیرا روکا، اور لوگوں نے بھی پکڑنا چاہا۔ لیکن میں کیا رکتا۔ لوگوں کے قہقہے اور لڑکوں کے آوازے اڑائے لیے جاتے تھے۔ قریب ایک مسجد نظر آئی۔ اس میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ جیسی طرح رگڑ رگڑ کر دھوئے۔ جب ذرا آدمی کی جون میں آیا تو سیدھا گھر پہنچا۔

میاں داؤد خدا لگتی کہنا۔ میرا اس میں کیا گنوارپن تھا۔ بھول چوک کس سے نہیں ہوتی۔ سالن کس سے نہیں گرتا۔ چھینک کسے نہیں آتی۔ اچھو کس کو نہیں ہوتا۔ شہر والے کیا فرشتے ہیں۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ شہر میں دو شخص بدنام جو بجو پہ ہنسے۔ اللہ ان بہادروں کو خوش۔ میں نے کچھ جان بوجھ کر تو یہ حرکتیں کی نہ تھیں۔ ہونی شدنی سامنے میں ہر ایک بھی میرے سامنے پڑی ہوئی آئی تھی، جو بھی ہونا تھا۔

شرمندہ، پریشان، لشتم پشتم گھر میں گھسا تو اندر قدم رکھتے ہی خالہ نے ٹانگ لی

خالہ:۔ دعوت کھا آئے۔ داؤد کو کہاں چھوڑا۔

میں:۔ وہ تو وہیں ہیں۔

خالہ:۔ ہے کیا جھوٹے برتن دھو رہے ہیں۔

میں:۔ (جل کر) مجھے کیا خبر۔

خالہ:۔ اچھا کہو کیا کھایا؟

میں نے یہاں عقلمندی سے کام لیا جو گذری تھی اس میں سے ایک بات نہ کہی۔ منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

خالہ:۔ کیوں شہر کی دعوت پسند آئی۔ شیرمال اور قورمہ ہوگا؟ کس کس سے ملے۔ کیا کیا باتیں ہوئیں۔ کچھ ہمیں بھی تو سناؤ۔

میں کیا جواب دیتا اس عرصہ میں خالو اباجی آگئے منہ ذرا پھولا ہوا تھا۔

خالہ:۔ کہاں رہ گئے تھے تم کو بھی جب تک کہیں جاکر کام نہ کرو چین نہیں آتا۔ برتن باسن سنگوانے میں ہوگے۔

خالو:۔ دم نہ ناک میں دم کرو، بتادوں گا!

خالہ:۔ ننھے نے کھانا تو اچھی طرح لیا۔

خالو:۔ نماز کا وقت آگیا ہے نماز پڑھوں یا تمہیں کہانی سناؤں؟

خالہ:۔ اچھا اتنا تو بتا دو کہ کسی سے کچھ بات چیت بھی ہوئی؟

خالو:۔ کیسی بات چیت؟

خالہ:۔ اے یہی لوگوں نے اسے دیکھ کر کچھ کہا تو ہوگا۔

خالو:۔ جی ہاں ساری محفل کی آنکھیں اسی پر لگی ہوئی تھیں۔

خالہ:۔ پھر سوچ لو۔ جہاں کہو رقعہ بھجوادوں۔

خالو:۔ بس چپکی رہو۔

خالہ:۔ کیوں؟ میں تو چاہتی ہوں کہ آئی عید پہ بہو گھر میں آجائے۔

خالو:۔ (جھلا کر) میں آپ ہی جلا ہوا آرہا ہوں تم اور جلانے لگیں۔ اپنے بھانجے کی بھی خبر ہے کیسے نام روشن کرنے والے ہیں۔ میں تو اسے اپنے پاس رکھ کر پچھتایا۔ وہی کہاوت ہوئی کہ کتے کی دم کو بارہ برس نلکی میں رکھا پھر جو نکالا تو ویسی ہی ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ آج اس نے وہ حرکتیں کی ہیں کہ مجھے کہیں منہ دکھانے کو جگہ نہیں رہی۔ بظاہر تو لوگ اس پر ہنسے لیکن دل میں

سب ہم پہ ہنستے ہوں گے کہ اچھا جوا لوز پالا ہے۔

میرے دعوت میں سے اٹھ آنے کے بعد ساری باتوں کا پتہ لگ گیا تھا۔ انھوں نے اول سے آخر تک پوری داستان خالہ اماں کو سنا دی اور آخر میں کہا میں جھوٹ کہتا ہوں تو اپنے لاڈلے سے پوچھ لو۔ یہ کہہ کر وہ تو ٹھنڈے سانس بھرتے نماز کے لئے مسجد چلے گئے اور خالہ صاحبہ افسوس کے ساتھ سر پہ ہاتھ رکھ کر میری طرف متوجہ ہوئیں۔

سنا میں جس کو دیکھو بادبان گز کا۔ شہر کے مرد تو اپنے نزدیک امانی کے بنے ہوئے ہیں ہی۔ عورتیں بھی کچھ کم نہیں۔ ان کی زبان جب چلنے پر آتی ہے تو میرٹھ کی قینچی بھی کیا چلے گی۔ مجھے جو تکلیف پہنچی تھی اس کا کون خیال کرتا۔ اپنی ٹکّے کی آبرو پہ وہ طومار باندھ کر سنتے سنتے میرے کان پک گئے۔ کہنے لگیں "اوئی لڑکے اتنا بڑا ہو کر ایسی بدتمیزی! سب لوگوں نے کیا کہا ہوگا۔ انھیں کیا خبر کہ تو گنوار کا لٹھ ہے وہ تو یہی جانتے ہوں گے کہ شیخ جی کے سارے گھر والے ایسے ہی نددیدے، پھوہڑ اور غلیظ ہوں گے۔ کوئی کیا جانے کہ ہم نے ایک گدھا پالا ہے۔ اب ہے یجو! تجھے کیسے کوئی بیٹی دیتا ہے ہماری ساری کی کرائی خاک میں ملا دی کرخندار تو ٹھوکیں گے بھی نہیں۔ نوج میں گھر کی بیٹھنے والی کھوئی چلی جاتی ہوں۔ ان کا شرم کے مارے کیا حال ہوا ہوگا۔"

غرض کہ ان کی بکواس جو شروع ہوئی تو سارا دن گزر گیا۔ رات کو روٹی بھی نہیں پکائی کبھی میری مری ہوئی ماں کو پیٹتیں کبھی گاؤں والوں پہ لعنتیاں بھیجتیں۔ میں خاموش بس نہیں چلتا تھا کہ گھر سے نکل جاؤں کہیں ڈوب مروں زہر کھا لوں کیا کروں۔ عشاء کے بعد خالو ابا دوکان بند کر کے آئے تو پھر سلسلہ جاری ہو گیا۔

خالہ:۔ میرا تو سارا لگایا ہوا باغ مٹ گیا۔ مجھ جلا گی کو کیا معلوم تھا کہ میرے نصیب میں سکھ نہیں ہے۔ اپنی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ پرائی اولاد کو بیٹا بنایا وہ بھی ان لوگوں کا کہ۔

خالو:۔ خدا کی مرضی۔ کچھ اس میں بھلائی ہوگی۔

خالہ:- تم نے تو کہہ دیا کہ خدا کی مرضی۔ میرے کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر دیکھو۔

خالو:- چلو جانے بھی دو۔

خالہ:- کیا جانے دوں۔ مجھے تو رہ رہ کر افسوس ہوتا ہے۔ کیا کیا امیدیں باندھے بیٹھی تھی یا اللہ اب میں کس کی شادی کروں گی۔ اسی کا بیاہ کر کے اپنا ارمان نکالتی۔

خالو:- تقدیر کی باتیں ہیں آدمی کو کیا اختیار۔ لو اٹھو دسترخوان بچھاؤ۔

خالہ:- میں نے تو کچھ پکایا ریندھا نہیں۔ دن بھر منہ اوندھائے پڑی رہی۔ دل قابو میں نہیں تھا۔ اب ذرا اچھی ہوں۔

خالو:- پھر کچھ کھاؤ گی۔ جو کہو بازار سے لے آؤں۔

خالہ:- میرا تو اس وقت کھانے کو جی نہیں چاہتا۔

خالو:- بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے۔ دعوت کا کھانا ذرا بھاری تھا لیکن شبو تو بھوکا ہوگا اس نے سارے کے کوئی آدھی روٹی ہی کھائی ہو گی۔

خالہ:- اس کے دیدوں میں خاک۔ اسے سنکیا۔ جو ہمیں جلائے اس کو انگارے۔

خالو:- ایسا نہ کہو۔ پرائی اولاد کو رکھنے کی بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ کہیں، اللہ کو برا معلوم ہو

خالہ:- خدا کرے، تو وہ اپنا گنوار پن کیوں نہیں چھوڑتا کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہیں۔ سولہ سترہ برس کا ہونے کو آیا۔ آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے۔

خالو:- اب وہ کیا کرے۔ خدا نے اس کو ایسا ہی بنایا ہے۔ گاؤں میں رہا۔ جھونپڑے میں پلا۔ ماں باپ نے کچھ سکھایا نہیں۔ جیسے اور گاؤں والے موٹی سمجھ کے سیدھے سادے ہوتے ہیں ویسا ہی وہ بھی ہے۔ شکر کرو کہ کوئی اور عیب نہیں۔

خالہ:- ہاں یہ تو سچ کہتے ہو۔ لڑکیاں بھی ایسی شرمیلی کیا ہوں گی۔

خالو:- اچھا تو بتاؤ کیا لاؤں۔ بازار کے کباب خمیری روٹیاں یا اگر مل جائے تو سالن اور چپاتیاں۔

خالہ:۔ دیر بہت ہو گئی ہے، چیز ہے گی خراب ٹھنڈی۔ میں تو جاتی ہوں دودھ جلیبیاں لے آؤں۔ دو چپاتیاں اور ذرا سا دن کا قیمہ رکھا ہوا ہے۔ میں اتنے اسے گرم کیے دیتی ہوں چلو منہ بھی سلونا ہو جائے گا جتنی دیر خالہ اور خالو میں باتیں ہوا کیں میرا خون خشک ہوتا رہا کیونکہ خالو یا خالہ اماں سے ڈرتے بہت تھے جب انھوں نے بڑی بی کو قائل کر دیا تو میری جان میں جان آئی۔ اب مجھے یہ تو اندیشہ رہا نہیں کہ خالہ یا خالو میرے ساتھ کوئی برا سلوک کریں گے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ آج نہیں تو آج کے بیسویں دن میرا بیاہ بھی ضرور ہو گا۔ تاہم یہ ڈر ہے کہ پھر کہیں دعوت میں نہ جانا پڑے وہ جائیں اور عقل لے جائیں۔ کہہ چکے ہیں کہ اسی طرح یہ آدمی بنے گا۔ بہت اچھا میں نے ٹھان لی ہے یا دعوتیں نہیں یا میں نہیں۔ دعوتوں نے مجھے کھایا میں نے دعوتوں کو۔

شوہر پرست بیوی

بابو فرزند علی دولت و اقبال کے لحاظ سے تو کچھ زیادہ خوش نصیب تھے نہیں۔ البتہ اولاد کی طرف سے انھیں پورا اطمینان تھا۔ پانچ بچے ہوئے پانچوں چراغ تعلیم بھی اپنی حیثیت سے زیادہ دلائی اور تربیت تو ایسی دی کہ انسان بنا دیا۔ یہ انھی کا کمال تھا کہ لڑکے بی اے ہو جانے کے بعد بھی اپنے بڑوں کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتے تھے جو پہنا دیا پہن لیا۔ جو کھلا دیا سر جھکا کر کھا لیا اور جو کہہ دیا کیا مجال ہے کہ کبھی اس کے خلاف کیا ہو۔ لڑکیاں انھیں تو ایسی کہ باوجود انگریزی تعلیم کے لونڈیوں کی طرح گھر کا سارا دھندا کریں۔ کھانا پکاتیں۔ کپڑے سیتیں۔ دکھ درد میں آپس میں ایک دوسرے کو تو کیا ملنے والیوں تک کی خدمت کرتیں۔ انھیں باپ کے پاؤں دبانے سے انکار تھا نہ ماں کی چمپی کرنے سے عار۔

رضیہ پانچوں بہن بھائیوں میں چھوٹی جتنی سب کی لاڈلی تھی اتنی ہی سمجھ دار، سعادت گزار اور سلیقہ شعار بھی تھی۔ عام طور پر جو گھر میں سب کا لاڈلا ہوتا ہے وہ کچھ بگڑ سا جاتا ہے اور گھر امیر ہو یا غریب ہو اس میں سینکڑوں تعلیمی اور تربیتی عیب پیدا ہو جاتے ہیں لیکن رضیہ نے ثابت کر دیا کہ اگر فطرت اچھی ہے تو زیادہ محبت کے ماحول میں کبھی کبھی زیادہ بہتر بن جاتا ہے۔ سیرت کے علاوہ اس کی صورت بھی اپنی دوسری بہنوں کی نسبت زیادہ دلفریب تھی

بابو صاحب شادی بیاہ کے معاملہ میں پرانے زمانہ کی رسمیات کے پابند تھے۔ ان کی رائے تھی کہ نسبی شرافت کے بعد صرف نیک چلنی کافی ہے۔ زیادہ سے زیادہ لڑکی میں گھرداری کا سلیقہ خاوند کی اطاعت کا شعور اور لڑکے میں تھوڑا سا مذہبی ذوق، کمانے کی قابلیت اور بیوی کو بیوی سمجھنے کا شوق ہو۔ تعلقات ازدواجی میں نہ وہ دولت کو مقدم سمجھتے تھے نہ حسن کو۔ تندرستی کا سوال ہندوستانی دماغ میں آنے کی چیز ہی نہیں۔ نہ ہمارے بزرگوں نے کبھی اسے اہمیت دی نہ آج اس پر کوئی توجہ ہے۔ اگلے وقتوں میں عورت مرد سب کی عام طور پر تندرستیاں اچھی تھیں اور شادی کا مقصد خانہ آبادی ہوتا تھا اس لئے یہ وہم بھی نہیں ہوتا تھا کہ بیمار لڑکی کسی کے پلے باندھ دی جائے گی یا داماد کا دولت مند ہونا کافی ہے مگر اس کمزوری اور بیماریوں کے زمانہ میں روپیہ۔ قابلیت، حسن وغیرہ ساری چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ نہیں دیکھی جاتی وہ چیزیں جن پر حقیقی ازدواجی مسرتیں منحصر ہیں ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ تندرستی اور رو دبی مردگی۔

چنانچہ انھوں نے اپنے اسی اصول کے ماتحت دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کی شادیاں کیں۔ نیت کا پھل کہ چاروں اپنے اپنے گھروں میں شاد و آباد۔ ایک رضیہ باقی تھی والدین کا جی نہیں چاہتا تھا کہ اسے پہلو سے جدا کریں لیکن جوان لڑکی کو کون گھر میں بٹھا سکتا ہے مولانا عارف کے چھوٹے لڑکے میاں ماجد سے نسبت ٹھہری۔ دونوں خاندان شریف خوش مزاج مذہبی۔ تیاری میں کیا دیر تھی۔ شب برات کے مہینے میں بات ہوئی۔ عید کی تیرھویں تاریخ نکاح ہو گیا۔ رضیہ خاتون ماں بہنوں بھاوجوں وغیرہ کو روتا چھوڑ کر نئے گھر نئے لوگوں میں چلی گئیں۔ ادھر اداسی تھی ادھر خوشیاں مگر ادھر والوں کے جذبات کی یہ نمائشیں چند روزہ ہوتی ہیں۔ دلی میں اصل شادی و غم تو ان کا ہے جو رشتۂ مناکحت میں جکڑے گئے ہیں۔ جن کا انحصار محض آپس کی محبت، اتفاق اور برتاؤ پر ہے۔

شادی کے وقت رضیہ کی عمر [illegible] برس تھی اور میاں ماجد کی ۱۹ برس کی۔ بعینہٖ

تو ایف اے سے آگے نہیں پڑھ سکی تھی لیکن مولانا عارف کے اثر اور رسوخ کی برکت سے
انھیں ایک دفتر میں ساٹھ روپے کی ایک جگہ مل گئی تھی۔ اس زمانے میں کہ بی اے اور ایم اے
کی قیمت چالیس پچاس سے زیادہ نہیں تھی یہ غنیمت تھا۔ رضیہ کا پیرا بھاگوان سمجھا گیا
اور بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ سونے کا گھاؤ رانی جانے یا راؤ۔ اندرونی تکالیف کا حال تو یہ دونوں
جانیں یا خدا۔ لیکن بظاہر بی رضیہ شمع تھیں اور سارا گھر پروانہ دیکھنے والوں کے نزدیک
میاں بیوی کی محبت قابلِ رشک تھی میاں اور بیوی کی ہر خواہش کی قدر کرتے تھے اور رضیہ
میاں کی رضا جوئی ہر معاملہ میں مقدم سمجھتی تھی ماجد کے والد۔ والدہ بہنیں اور بھاوجیں رضیہ
کی سلیقہ مندی اور فرماں برداری سے بیحد خوش تھے۔ صرف ماجد کی والدہ ساس ہونے
کا وقار جتانے کے لیے البتہ عام عورتوں کی طرح کبھی کبھی ناراض ہو جاتیں تو اس کا تدارک آسانی
ہو جاتا اور رضیہ نہایت خوش اسلوبی سے ان کی خفگی کو برداشت کر لیتی۔

ماجد صاحب بہت خاموش، سادہ مزاج اور شرمیلے نوجوان تھے۔ ان کی عادتیں سیدھی
ان کی ضروریات مختصر اور خواہشات بالکل محدود تھیں۔ اس عمر والے میں جب کہ خوش حالی
سے بسر کرنے کا سامان بھی ہو جو امنگیں اور چونچلے ہونی چاہییں ان میں مطلق نہ تھی نہ پان
سگرٹ اور چائے کا شوق نہ سینما اور دوستوں سے دلچسپی۔ دفتر سے گھر آئے کھانا کھایا۔ نماز
پڑھی اور لیٹ گئے جی گھبرایا تو کوئی کتاب لے بیٹھے۔ تنہائی زیادہ پسند تھی جلد سوتے تھے
صبح بلاناغہ نہانا۔ نماز پڑھنا اور قرآن شریف کی تلاوت ان کا شغل تھا۔ بہت ہی بے لاگ
زندگی بسر کرنے والے مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ گھر یا باہر شاید ہی کبھی کسی سے تیز ہو کر بولے
ہوں۔ بھتیجے بھانجے اکثر انھیں چھیڑتے تھے مگر ان سے بھی کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ ان کے
ان سوالوں کا جواب ان کے پاس فقط ایک ہلکی سی مسکراہٹ یا سر پر ہاتھ پھیرنا تھا۔ ایک مرد کی
یہ ایسی صفات ہیں جن سے عورتوں کو سابقہ پڑتا ہوگا۔ یہ اسباب ظاہر اس فردوس فضا میں
رہ کر رضیہ کے لیے کسی دلی شکایت کا موقع ہی نہیں پیدا ہوا اور پانچ سال اسی طرح گزر گئے

بہار کے بعد خزاں اور سکون کے بعد طوفان انسانی زندگی کے لئے لازمی ہے یہ عارضی اور مصنوعی اطمینان آخر ایک مصیبت پریشانی اور قلبی تکلیف کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شادی کو چار برس ہو گئے تھے کہ یکایک میاں ماجد کو اپنی بیوی کی صحت کا فکر ہوا۔ وہ اچھی خاصی تندرست تھی۔ چہرے پر شباب کا حسن نگاہوں میں تبسم نہ کھانے پینے میں فرق نہ پہننے اوڑھنے کے انداز میں تبدیلی۔ لیکن وہ آتے اور جاتے یہی کہتے کہ دلہن بیمار ہیں۔ بیسیوں حکیم اور ڈاکٹر بدل ڈالے۔ سینکڑوں دوائیں کھلا پلا دیں رضیہ غریب ان کی محبت اور ہمدردی کی مغلوب ہو کر کچھ نہ بولتی۔ بری سے بری دوا کو شہد کی طرح بے حجت پی جاتی اگر اتفاقیہ طور پر میاں ماجد کی دوڑ دھوپ کا راز نہ کھل جاتا تو خدا معلوم رضیہ اور کتنے دن تک اندھیرے میں رہتی ہوا یہ کہ ایک حکیم صاحب کہیں باہر سے رضیہ کے علاج کو بلائے گئے اور انہوں نے عام صحت کے متعلق کچھ پوچھنے کے بدلے ایسے سوالات کئے جن سے رضیہ کھٹک گئی۔ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ عقیل و فہیم اور پھر معاملہ اس کی اپنی ذات سے تعلق رکھنے والا۔ کیوں نہ بھید کو پا جاتی۔ اصلی چیز یہ تھی کہ شادی کو پورے پانچ سال گزر گئے تھے اولاد کوئی ہوئی نہ تھی اور ہندوستانی رواج کے مطابق اولاد نہ ہونے کا سارا الزام رضیہ پر تھا۔ فطرت کا بھی عجیب مذاق ہے۔ مرد کی کمزوریاں بھی عورت کے سر تھوپی جاتی ہیں رضیہ اگر ماجد کی وظیفۂ شوہری سے غفلت اور اس کے جنسی نقائص کو نظر انداز نہ کئے ہوئے تھی تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ماجد اپنے کو بھول جائے اور رضیہ شوہر کی مردانہ قوتوں سے بے نیاز ہو کر بچے بھی پیدا کرنے لگے۔

تاہم رضیہ کو اپنی طبی معلومات کا دعویٰ نہ تھا وہ بھی شبہ میں مبتلا تھی کہ ایک روز دوپہر کے وقت جب کہ ماجد کا گھر بند بنتے بنتے پلنگ پر لیٹ کر اس نے غنودگی کی حالت میں رضائی سے اپنا منہ ڈھانپ لیا تھا۔ کمرے کے کواڑ بند تھے۔ صحن دالان سے کچھ آہستہ آہستہ باتوں کی آوازیں کان میں آئیں۔ ہوشیار ہو کر دروازے کی درازوں میں سے جو جھانکا تو

ساس نندیں اور جٹھانیاں سب جمع ہیں اور کسی اہم مسئلہ پر رازداری کے ساتھ گفتگو ہو رہی ہے پانچ برس کے بعد گھر والوں کی اچانک بے رخی سے رضیہ کے دل میں ایک بے چینی سی تو پیدا ہو ہی چکی تھی اب جو اس نے دیکھا کہ میرے کمرے کی طرف نگاہیں ہیں اور کوئی تیوری چڑھا کر بات کرتی ہے تو کوئی منہ بنا کر۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اور کواڑوں کی جھری سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔ رضیہ اور اس کی ساس نندوں میں کئی گز کا فاصلہ تھا اور باتیں چپکے چپکے ہو رہی تھیں۔ پوری گفتگو تو کیا سننے میں آتی۔ چند جملے وہ بھی ٹوٹتے ہوئے ادھورے کانوں میں پڑے خوش دامن صاحبہ جن کو سب بہوؤں سے بڑھ کر رضیہ کا چاؤ تھا فرما رہی تھیں۔

"بانجھ عورت .... بیوی خدا نہ کرے .... مرد کے لئے گھن ہے .....
ماجد کی جان کوئی مجھ کو دو بھر ہے .... میرا بچہ اس غم میں آدھا رہ جائے اور میں ٹُکر ٹُکر بیٹھی دیکھا کروں۔ نہیں بیوی اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔"

شوہر کی معصوم خواہش کا علم رضیہ کو ہو چکا تھا۔ گھر کی ٹھر ٹھرے بھی وہ ناواقف نہیں رہی تھی اور اپنی جنس کی ساری کمزوریاں بھی اس کے سامنے تھیں کہ یہ خوا کی بیٹیاں اپنی فطرت سے لاچار ہیں خدا ان سے اپنی پناہ میں رکھے یہ جہاں کسی کے پیچھے پڑیں۔ نیک و بد عذاب و ثواب کا امتیاز مٹ گیا اب جو اپنی ساس کی زبانی اپنے بانجھ پن ہونے کا ناقابل معافی الزام سنا تو زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ سر چکرانے لگا۔ اگر دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ نہ جاتی تو شاید گر پڑتی۔ ماجد اپنی پیدائشی کمزوریوں یا لڑکپن کی غلط کاریوں کو چھپانے کے لئے اپنے گھر والوں سے جو کچھ کہتے ہوں گے اور سوچتے ہوں گے یا چاہتے تھے ان سب کا ایک دھندلا سا نقشہ رضیہ کے ذہن میں کھنچ گیا۔ شریفوں کی بیٹی مرنے بھرنے والی۔ شوہر کی پرستش خواہ دو دمڑی کا ہی کیوں نہ ہو۔ ختم ہو کر رہ گئی۔ بجائے اس کے کہ میاں ماجد شرماتے ... مرد بن کر اس کی آبرو بچاتے۔ وہ عورت ہو کر ان کی پردہ پوشی

زرتی رہی۔ اتنا البتہ ہوا کہ اسے گھر والوں اور ماجد کے رشتہ داروں کے سامنے آتے ہوئے حجاب آنے لگا۔ وہ بھی اس لیے کہ اس مچل کے آخری نتیجہ کا خیال اس کی ہمت کو پست کررہا تھا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک رات کوئی شاید دس بجے ہوں گے ماجد صاحب اپنے پلنگ پر لحاف اوڑھے خراٹے لے رہے ہیں اور رضیہ پڑوس کی ایک یتیم لڑکی کے لیے روئی کی کرتی سی رہی ہے کہ برابر کے کمرے میں سے باتیں کرنے کی آوازیں آنی شروع ہوئیں یہ کمرہ ماجد کی والدہ اور چھوٹی بہن سکینہ کے لیے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی مخصوص تھا۔ گھر کی عورتیں عموماً دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد یا رات کو سارے کام دھندوں سے فرصت پاکر اپنی انجمن آراستہ کیا کرتی ہیں۔ پانوں کی جگالی ہوتی جاتی ہے اور دنیا بھر کے عیب وصواب نکالے جاتے ہیں۔ رضیہ کے ہاں بھی انہی اوقات میں بزم آرائیاں ہوتی تھیں۔ دن کو موسم کے لحاظ سے دالان یا صحن میں اور رات میں کمرہ کے اندر یا بالاخانہ کی چھت پر۔ رضیہ کو بھی کن سوئیاں لینے کی عادت نہ تھی۔ جن عورتوں کی خود اپنے کیرکٹر پر اعتماد ہوتا ہے وہ دوسروں کی باتیں سننا خصوصاً جب کہ ان میں رازداری کا شبہ ہو عیب سمجھتی ہیں۔ لیکن معاملہ کی اہمیت نے کچھ ایسی شدت پکڑ لی تھی اور رضیہ کے احساس خودداری کو اس قدر مجروح کردیا تھا کہ اپنی ساس نندوں کے مشورے سننے کے لیے ہمہ تن گوش رہتی تھی۔ وہ فوراً اپنے کمرے سے نکل اپنی خوشدامن کے کمرے کے دروازہ کے پاس پہنچی اور کان لگا دیے اس سے پہلے جو گفتگو ہو چکی تھی اس کا تو رضیہ کو علم نہیں رہا اس نے جو سنا وہ یہ تھا۔

بڑی نند:۔ اماں جان آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر مگر اس میں اِن بیچاری کا کیا گناہ یہ تو اللہ کی دین ہے۔ کچھ نہ کچھ اس کی مصلحت ہوگی۔

خوشدامن: تو میں نگوڑی اسے کیا کہہ رہی ہوں۔ شکایت تو دینے والے ہی سے ہے۔"

ہے۔ نہیں معلوم کس منحوس گھڑی بات ٹھہری تھی کہ شادی ہوئی نہ چھوئی بہار ہو گئی۔ سہرے کے پھول نہ کھلنے تھے نہ کھلے۔

بڑی نند :- خدا کی خدائی میں کس کو دخل ہے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ آپ اتنی بے آس کیوں ہوئی جاتی ہیں۔ اللہ اور اللہ کے حبیب سے امید رکھیے

خوشدامن :- بس بی رہنے دو۔ سال نہیں دو سال نہیں پورے پانچ برس ہو گئے ڈاکٹر حکیم ملا سیانے سب کو دیکھ لیا ابھی تمہاری آس ہی نہیں ٹوٹی۔ بیوی اب کوئی آسمانی فرشتہ تمہاری بھاوج کو سوجیا کرنے آئے گا۔

بڑی نند :- میری دیورانی کو بھی تو دس برس کے بعد اللہ نے بیٹا دیا۔ . . . . اور میاں ماجد ہی ہیں . . . . انہیں بھی تو کسی حکیم ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا۔

خوشدامن :- لڑکی ہوش میں آ۔ تمہاری دیورانی کی اور بات تھی۔ بچہ جننے والیوں کے طور ہی جدا ہوتے ہیں۔ بانجھ عورت کو کون بچہ دے سکتا ہے اور یہ تم نے کیا کہا کہ ماجد کو بھی دکھانا چاہیے۔ مردوں میں کیا عیب ہوتا ہے۔ ماجد جیسا لڑکا چراغ لے کر ڈھونڈو تو نہیں ملے گا جیسی اس نے بیوی کی تابعداری کی ہے دوسرا کر تو دے میں تو کہتی ہوں کہ اب اس کو اللہ پر چھوڑ دو۔ نصرت علی کی لڑکی کو میں دیکھ چکی ہوں۔ تمہارے ابا راضی ہو جائیں تو کل بیاہ لاؤں۔

بڑی نند :- توبہ ماجد کی کیوں مٹی خراب کرتی ہو۔ خدا جانے کیا بات ہے اولاد کے ہونے میں ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی۔ میں تو پھر یہی کہوں گی کہ . . . .

خوشدامن :- کیا کہا! ماجد کی مٹی خراب ہو جائے گی۔ بیٹی خدا سے ڈرو۔ تمہارے نزدیک میں ماں ہو کر بیٹے کا برا چاہتی ہوں۔ توبہ کرو۔ آج کل کی لڑکیاں دو حرف کیا پڑھ لیتی ہیں کہ خدا و رسول کے حکم کو ہی بھول جاتی ہیں۔ دیدے کا پانی ڈھل جاتا ہے۔ توبہ ارے ایسی بے تکی کی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تیری لڑکیاں جوان ہوں گی تو ان کی شادی

بغیر ڈاکٹر کے دکھائے کسی سے نہ کہیو۔ وہ بیوی اب مرد بھی ڈاکٹر حکیم کو دکھائے جانے لگے۔

یہ باتیں سن کر رضیہ کا دل کانپ اٹھا جس بات کا کھٹکا لگا ہوا تھا سامنے آگئی۔
ہندوستانی سماج کی ذہنیت سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ ماجد کی والدہ کی یہ خیالات کتنے مناسب حال تھے۔ ماجد کے عقدِ ثانی کی تحریک اس کے لئے کس درجہ معاشرتی اور حق بجانب تھی۔ رضیہ کو تعجب یہ تھا کہ میاں ماجد نے ایک لمحہ کے واسطے بھی اپنی حالت پر غور نہ کیا۔ گھر کی فضا میں وہ ایسے مسحور ہوئے کہ قال اللہ و قال الرسول کا سارا جذبہ عورتوں کے جھرمٹ میں فنا ہوگیا۔ لیکن فی الحقیقت اس امر خاص میں وہ زیادہ قصور وار نہ تھے۔ ماحول کا اثر انسان پر پڑتا اور ضرور پڑتا ہے آزاد سے آزاد خیال آدمی بھی اپنے گرد و پیش سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ پھر ماجد جیسا آرام طلب شخص 'شرمیلا' مردانہ صحبتوں سے بھاگنے والا قناعت پسند ضمنی لذتوں کا جویا چند روز نہ گزرے تھے کہ رضیہ پر ان کی مغلوبیت کا اظہار ہونے لگا۔ ماجد صاحب نے اپنی والدہ کی تجویزوں کے سامنے سر جھکا دیا۔ میاں بیوی کے ظاہری تعلقات غیر معمولی خاموشی سے بدل گئے آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے جو موانست کا اظہار ہوتا تھا اس میں بھی فرق آگیا۔ یہاں تک کہ رضیہ خاتون اپنا غم غلط کرنے کے لئے اپنے میکے چلی گئیں میاں ماجد کا قاعدہ تھا کہ جب تک بیوی اپنے والدین کے پاس رہتی تھیں روزانہ جایا کرتے اور چوتھے پانچویں دن کے بعد گھر چلنے کا تقاضا شروع کر دیتے۔ اس مرتبہ ان کی یہ عادت بھی بدلی ہوئی نظر آئی۔ گھر چلنے پر اصرار تو کیا بیوی کے پاس جانا بھی بے تکلف نہ رہا۔ رسمی طور پر کے اختیار و بادل ناخواستہ جاتے۔ خاموش بیٹھے رہتے اور چلے آتے۔ بیس دن گزرے مہینہ گزرا۔ پورے چھ مہینے ہو گئے اور میاں رضیہ سے گھر چلنے کا نام نہیں لیتے۔ آخر بے غیرت بن کر خود رضیہ نے گھر چلنے کو کہا۔ ماجد صاحب بہت گھبرائے اور بات بنا کر ٹالنا چاہا ابھی کیا جلدی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہو جانے دو۔ جو میکے میں آرام ملتا ہے وہ سسرال

میں نہیں منشا۔ یہ میں تمہارے ہی لئے کہتا ہوں ورنہ تمہارا گھر ہے"۔

عورت کے نسوانی جذبات کا میاں ماجد کو کیا تجربہ ان کے نزدیک عورت کو جذب کرنے اور عورت میں جذب ہونے والی چیز ہی نہ تھی وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ بیاہی بیٹی پڑوس برابر ہو جاتی ہے۔ ایک عورت کی دنیا شادی سے پہلے کچھ اور ہوتی ہے اور شادی کے بعد کچھ اور ہو جاتی ہے اس کی محبت کا مرکز ہی بدل جاتا ہے غرض یہ کہ میاں ماجد نے ہر چند ٹالا بہانے کئے مگر رضیہ تو اپنی قسمت کا تماشا دیکھنے کے لئے بیتاب تھی تکلف کو بالائے طاق رکھ شوہر کی مرضی کے خلاف ڈولی منگائی۔ سسرال آپہنچی۔ آنے کو تو آگئی۔ اس کا گھر تھا۔ بیٹی بھی شریفوں کی اور بہو بھی شریفوں کی۔ کون روکتا اور کیا کہہ کر روکتا۔ لیکن ایسا معلوم ہوا کہ نہ یہ وہ گھر ہے جس میں بیاہ کر آئی تھی نہ وہ لوگ ہیں جو سر پر آنچل ڈال کر لائے تھے۔ ناخواندہ مہمان کی طرح ڈولی سے اتری اور اپنے کمرے میں جا بیٹھی۔ خوش دامن الگ خاموش نندیں جٹھانیاں جدا دامن سمیٹے ہوئے۔ گویا رضیہ اچھوت تھی اور وہ سب برہمن زادیاں۔ چھوٹے بڑے تمام نہ زیادہ بات کرتے نہ اس کا میل جول پسند کرتے اور تو اور درمیان ماجد بھی ہر وقت منہ تھوتائے رہتے۔ پھر بھی وہ رضیہ کے خاوند تھے۔ ان پر رضیہ کا حق تھا اور رضیہ کے ہر نیک و بد کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی تھی اس لئے رضیہ نے بہت چاہا کہ ماجد سے گفتگو کر کے معاملہ کو صاف کرے لیکن نہ اسے ہی مدعائے دل زبان پر لانے کی جرأت ہوئی نہ ماجد صاحب اپنی خلقی کمزوریوں کی وجہ سے رضیہ کی تقدیر کا فیصلہ سنا سکے۔

رضیہ کی زندگی جس عذاب کی گھاٹی سے گذر رہی تھی اس کا اندازہ کوئی کیا کر سکتا ہے" جس کی نہ پھٹی ہو بوائی وہ کیا جانے پیر پرائی"۔ کبھی سوچتی کہ جلدی کیا ہے مصیبت جتنی دیر میں آئے اچھا ہے۔ قضا و قدر کا حکم ٹل نہیں سکتا۔ جو ہونا ہے ہو جائے گا۔ گھبرائے سے کیا فائدہ۔ کبھی کہتی۔ پھانسی گلے میں پڑنی ہے تو آج ہی کیوں نہ پڑ جائے۔ کل کا انتظار

کس لیے، لیکن ان استدلال سے نہیں ابھر سکتا تھا۔ اس کا جی گھبرانے لگا، اور اس ذہنی کشمکش کے نتیجے کے طور پر آخر رضیہ نے یہ ٹھان لی کہ کچھ بھی ہو ماجد صاحب سے کھل کر گفتگو کرنی ضروری ہے۔ تذبذب کی زندگی سے بہرحال یقین کی زندگی کم تکلیف دہ ہوتی دل میں یہ طے کر کے رضیہ موقع کی منتظر تھی کہ اسے خیال آیا کہ ماجد میاں سے ان کی سرد مہری کا سبب پوچھنے سے پہلے کسی دوسرے ذریعہ سے معلومات بہم پہنچانا زیادہ مناسب ہے تاکہ بحث بلا دلیل نہ ہو اس لیے کہ اب وہ پہلی سی مجلس آرائیاں اور سرگوشیاں تو تقریباً ختم ہو گئی تھیں اور معاملات کا اس قدر آگے بڑھ کر یکایک رک جانا خطرناک تر نظر آ رہا تھا کہ "بو فساد کی آتی ہے شبہ پانی میں"۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے رضیہ نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ حسنہ اپنی چھوٹی نند پر جو ابھی بارہویں برس میں تھی اس کا خیال جا۔ چنانچہ اس کو پڑھانا شروع کیا سیدھی سادی لڑکی اور پھر رضیہ کی محبت بھری آنکھیں دو چار ہی دن میں کھل گئی سارا سارا دن اور رات کے دس دس بجے تک رضیہ پاس بیٹھی رہتی۔ جگ بیتی کہانیوں کے ساتھ یہ آپ بیتی سناتی، اور وہ نہایت دلسوزی سے سنتی۔ ہوتے ہوتے ایک دن دوپہر کے بعد دونوں نند بھاوجیں کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بارش ہو کر تھمی تھی سرد ہوا کے جھونکوں سے بچنے کے لیے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ رضیہ نے ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد حسنہ سے پوچھا "حسنہ! پچھلے دنوں اماں جان یہ کس کی شادی بیاہ کا ذکر کر رہی تھیں۔ حسنہ گھبرا گئی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں بھی بچہ تو نہ تھی کہ بات کا پہلو نہ سمجھتی۔ بھاوج کو دیکھ کر نیچی نگاہ کر لی اور کچھ جواب نہیں دیا۔

رضیہ:۔ کیوں چپ کیوں ہو گئیں۔ نہیں بتاتا تو ویسی کہہ دو۔

حسنہ:۔ کیا بتاؤں۔ بڑے بھائی جان کے سالے کی بات تھی۔

رضیہ:۔ اللہ اللہ بی حسنہ۔ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم بھی بات چھپاؤ گی۔ نصرت علی کی لڑکی آخر کس کے لیے مانگی جا رہی ہے۔

حسنہ بچہ نہ سہی لیکن موجودہ دورِ تہذیب کی دیوی یا قانون بھی نہ تھی کہ معاملات پر گفتگو کرنا جانتی۔ سٹ پٹا گئی اور یہ کہہ کر بات بنانے کی کوشش کی "بھائی جان آپ نے کس سے سنا۔ یوں ہی آپ کو شبہ ہو گیا ہے باتوں باتوں میں چھوٹے بھائی کا بھی ذکر آگیا ہوگا۔ اماں جان نے اس لڑکی کو کہیں آپا رقیہ کی سسرال میں دیکھ لیا تھا بس اور کوئی بات نہیں"۔ رضیہ نے حسنہ کی سادگی اور گھبراہٹ سے فائدہ اٹھایا۔ بولتے ہوئے تاڑ کے انگلی رکھ کر کہا۔

رضیہ:- اوہو بی حسنہ۔ ایسی بھی دادی۔ تمہارے بھائی تو کہہ دیں اور تم نہ بتاؤ۔

حسنہ رضیہ کا منہ دیکھنے لگی۔ رضیہ کی آنکھوں میں آنسو جھلک گئے تھے۔

"تو بھائی جان نے آپ سے کہہ دیا۔ ایسی باتیں کہیں کہنے کی ہوتی ہیں ...... کیا کہا تھا انھوں نے؟

رضیہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اگر اسے کرید نہ ہوتی تو شاید ضبط نہ کر سکتی زبردستی آواز کو بنا کر بولی "پوری بات تو نہیں بتائی۔ اتنا ہی کہا۔ ..... بس اتنا ہی ..... یہی کہ وہ ...... یعنی اماں جان پیام بھیجنے والی ہیں ...... اور ..... اس طرف والے رضامند بھی ہیں"۔

حسنہ:- (کچھ شرمندہ سی اور کچھ ہمدردی سے متاثر) بھائی جان اب تو بھید کھل ہی گیا۔ چھپانے سے کیا فائدہ۔ مگر آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی، کام خوشی سے نہیں ہو رہا۔ سب کے ہاں بچے ہوں اور بھائی جان کے نہیں۔ اماں جان کو وہم آتا ہے۔

رضیہ:- میرا بانجھ ہونا تو ظاہر ہے ...... جم جم ہو ...... اچھا پھر نکاح کب کا ٹھیرا ہے۔

رضیہ کے کلیجہ میں اب ضبط کی تاب نہیں رہی تھی۔ آنسو امنڈ آئے۔ آواز بھر آگئی حسنہ یہ دیکھ کر رضیہ کو لپٹ گئی اور رونے لگی۔ اسے واقعی رضیہ سے محبت تھی لیکن بس

نہ تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹی اور اس پر ستم یہ کہ کنواری اس کا ایسے معاملات میں دخل دینا ہمارے سماج کی توہین تھی جسے کوئی شریف برداشت نہیں کر سکتا۔ بڑی دیر کے بعد دونوں کے حواس درست ہوئے وقت کافی گزر گیا تھا اور رضیہ کا دل اب تنہائی چاہتا تھا اس نے حسنہ سے کہا" بہن اب تم جاؤ آرام کرو۔ میرے نصیب میں جو لکھا ہے وہ پورا ہوگا۔ کہیں اماں جان خفا ہوں۔ میرا سایہ بھی تمہارے لئے اچھا نہیں۔

حسنہ:۔ بھابی جان آپ اپنا دل بھاری نہ کریں۔ خدا کو یاد کیجئے۔ بچہ ہو جاتا تو یہ جھگڑا کاہے کو ہوتا ..... اس کے بعد اس نے رضیہ کے گلے میں باہیں ڈال کر خوب پیار کیا اور چلی گئی۔

بظاہر اب ماجد صاحب سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں رہی تھی بلکہ اس کا ارادہ تھا کہ اس رنگنی کو بغیر الاپے ہی رہنے دیا جاتا لیکن سوت کے معاملہ میں عورت ساری مصلحتیں بھول جاتی ہے۔ دوسرے دن اتفاق سے اتوار تھی حسب معمول میاں ماجد تلاوت کلام مجید سے فارغ ہو کر کمرے میں جو آئے تو رضیہ سے نہ رہا گیا دامن پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اگلی پچھلی ساری شکایتوں کے دفتر کھول دیے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جتنی تلخی اس کی سرشت میں تھی ایک دفعہ ہی کل کی کل دی شکایتیں ناواجب نہ تھیں کیا جواب دیتے ندامت ماتھے سے ٹپک رہی تھی لیکن اپنی کمزوریوں کا کھلم کھلا اعتراف کرنا بھی شان مردانگی کے خلاف تھا اس لئے اپنی بے رخی کا الزام کچھ رضیہ کے سر تھوپا اور کچھ اپنے والدین کے۔ رضیہ کے سر پر اس وقت سوکن کا بھوت سوار تھا بھر کر بولی ایسے ہی تو آپ ننھے بچے ہیں۔ مجھ پہ الزام لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ میں بانجھ ہوں یا آپ دبھت کے مردوے۔ کیوں نہیں صاف کہہ دیتے ہیں جو اتنے دن سے اپنی زبان پر قفل ڈالے بیٹھی رہی۔ آپ کی بدنامی کے ڈر سے اپنی جوانی خاک میں ملا دی اس کا یہی ثمرہ ہے کہ آپ میری تذلیل کے درپے ہیں۔

ماجد:۔ میں نے انہیں سمجھا تو دیا مگر وہ نہ مانیں تو میں کیا کروں۔

رضیہ :۔ کیا آپ نے صاف صاف ان سے اپنی حالت بیان کر دی۔

ماجد:۔ صاف صاف تو نہیں مگر بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔

رضیہ :۔ انھیں شبہ میں نہ رکھئے کہہ سکتے ہیں تو کھول کر کہہ دیجئے تاکہ وہ ایک دوسری لڑکی کا صبر نہ سمیٹیں۔

ماجد:۔ میں سب کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن ابا جان اور اماں جان کو اس ضعیفی میں رنج نہیں دینا چاہتا۔

رضیہ:۔ سبحان اللہ۔ فرماں برداری کے اظہار کا موقع بھی یہی ہے کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے۔ ایک میری زندگی تباہ ہوئی دوسری اور معصوم کو کاٹھ میں پھانسو۔ محض اس لئے کہ والدین کی خوشی پوری ہو جائے۔ یہ کہاں کا مذہب اور کس خدا کا حکم ہے۔

ماجد:۔ کچھ بھی کہو میں والدین کی خواہش نہیں ٹال سکتا۔

رضیہ :۔ تو یہ شادی ہو کر رہے گی۔

ماجد :۔ مشیت کے سامنے مجبوری ہے۔

رضیہ :۔ بے شک آپ تو مجبور محض ہیں۔ اچھا ایک بات تو بتائیے۔ آپ مجھ پر غلط الزام لگا کر دوسری بیوی لانا چاہتے ہیں کہ بچہ پیدا ہو۔ حالانکہ یہ خواہش مرد کی نسبت عورت میں زیادہ ہوتی ہے پھر اگر میں آپ کی ناقابلیت کو مدنظر رکھ کر اپنی گود بھرنے کے لئے دوسرا خاوند تلاش کر دوں تو آپ خوشی سے گوارا کر لیں گی۔

ماجد :۔ لاحول ولا قوۃ۔ اسلامی قانون کے خلاف دنیا میں کوئی مسلمان مرد عورت کی یہ ناجائز آرزو پوری کر سکتا ہے؟

رضیہ :۔ جی ہاں۔ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو۔ اسلامی قانون مردوں ہی کے لئے تو وضع کیا گیا ہے خیر کہئے بات چیت تو سب ٹھیک ہو چکی ہے نا۔

ماجد:۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ تم تو منطقی باپ کی منطقی بیٹی ہو۔ یہ کہتے ہوئے میاں ماجد کمرے سے باہر چلے گئے۔

اس گفتگو کو کئی ہفتے گزر گئے رضیہ کی اندرونی کیفیت تو کوئی کیا جان سکتا۔ البتہ بظاہر اسے صبر سا آگیا تھا ایک روز سہ شام وہ نہا کر بیٹھی بال سکھا رہی تھی کہ ماجد صاحب دفتر سے سیدھے اس کے پاس آئے، اور کہنے لگے کہ آج منگنی کی رسم ہے تمہیں بھی جانا چاہیئے؟

رضیہ:۔ قربان آپ کی ستم ظریفی کے۔ میرے قتل نامہ پر مجھ ہی سے مہر کراتے ہو۔

ماجد:۔ تو کیا تمہیں جانے سے انکار ہے۔

رضیہ:۔ اپنے ہاتھ سے کسی نے اپنا سہاگ اتار کر دوسری کو پہنایا ہو تو بتادو۔

ماجد:۔ یہ فضول باتیں میں نہیں سننا چاہتا ہو تو جاؤگی یا نہیں۔

رضیہ:۔ نہیں۔

ماجد:۔ انتقام لینا چاہتی ہو؟

رضیہ:۔ ایک پردہ نشین بے زبان کمزور عورت کیا انتقام لے سکتی ہے۔ انتقام تو خدا لے گا وہ منتقم حقیقی ہے۔ ظالم و مظلوم دونوں اس کی نگاہ میں ہیں۔

رضیہ کے تیور بدلے ہوئے دیکھ کر ماجد صاحب نے اپنی غیر معمولی تیزی کو نرمی سے بدل دیا اور دبی زبان سے کہنے لگے۔ نہیں آپ کو جانا چاہیئے آپ کا جانا اس لئے ضروری ہے کہ لڑکی والے آپ سے کچھ باتیں کرنی چاہتے ہیں۔ جبر تو ہے نہیں آپ چلی جائیں تو اچھا ہے اماں جان کی بھی بات رہ جائے گی اور وہ لوگ بھی مطمئن ہو جائیں گے۔

کچھ تو میاں ماجد کا مایوسانہ انداز گفتگو اور کچھ یہ خیال کرکے کہ اب پہلی سی عزت تو رہی نہیں ساس سسرے کی مرضی کے خلاف چل کر اتنی بات بھی جاتی رہے گی رضیہ نے جواب دیا کہ "بہت اچھا۔ اگر آپ کی عدالت کا یہی فیصلہ ہے کہ سزائے موت کا مستحق

اپنے ہاتھ سے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالے دیتی حاضر ہوں۔ آپ خاطر جمع رکھیں تعمیل حکم ہوگی۔

قصہ مختصر بی رضیہ بھی اپنی سسرال والوں کے ساتھ سوکن کو دیکھنے اور منگنی کی رسم ادا کرنے گئیں اسکی حالت بہت نازک تھی۔ چہرہ کمبلایا ہوا ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا ہر چند اس نے علیحدہ رہنے کی کوشش کی مگر دلہن کی ماں سر کیتے سر کتے اس کے پاس آہی گئیں، اور دو چار سوالات ایسے بے ڈھب کئے کہ رضیہ جیسی نیک سرشت اور عاقبت اندیش عورت تھی جو اس کٹھن گھاٹی سے پار ہوگئی دوسری کوئی ہوتی تو خدا جانے کیا ہوتا۔ پھر انھوں نے گھر کی دوسری عورتوں سے یہ کہہ کر دیا کہ دیکھو شریف بیویاں ایسی ہوتی ہیں۔ خاوند کی خوشی سے کام ہے اس صورت میں میری راحت کو سوکن اپے کا کیا اندیشہ۔ رضیہ کا کلیجہ منہ کو چلا آتا تھا۔ اس نے بیزار کوشش کی کہ چپ بیٹھی رہے لیکن منہ بند کرتے کرتے زبان سے نکل ہی گیا کہ "جی ہاں شریف بیویوں کو ایسا ہی کرنا پڑتا ہے" رضیہ کا یہ معنی خیز فقرہ کسی نے سنا یا نہیں سنا اور سنا تو اس سے کیا نتیجہ نکلا۔ ہمیں خبر نہیں۔ بہر حال منگنی ہوگئی اور ساتھ ہی نکاح کا دن بھی مقرر ہوگیا۔

عورت خاوند کے نام پر مٹنے والی عورت۔ ایک گھر سے لال جوڑا پہن کر آنے اور دوسرے گھر سے سفید کفن اوڑھ کر جانے والی عورت کس قدر بھولی کتنی وفادار ہوتی ہے رضیہ کے لئے ماجد میں کوئی کشش نہ تھی۔ وہ اس کا برائے نام شوہر تھا۔ آخر ماجد کے اس نکاح سے رضیہ کی کیا چیز چھن رہی تھی اس کے کس عیش کا خون ہو رہا تھا اس کے تو تمام جنسی جذبات اول دن سے کنوارے تھے مگر نہیں اس کو اس برائے نام خاوند کے چھننے کا بھی اتنا ہی قلبی احساس تھا جتنا ایک شوہر پرست بیوی کو اپنے کیف شباب سے بھرپور شوہر سے ہوتا ماجد کے جیتے جی رنڈاپے کی ساری صورتیں اس کے سامنے آگئی تھیں۔ آنے والے واقعات کا ناٹک اس کے تصور میں کھیلا جا رہا تھا

خود ساختہ دلیلوں سے وہ لاکھ اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتی لیکن بے فائدہ رنگ برنگ کے نقشے اسے دکھائی دیتے۔ کبھی وہ ماجد صاحب کو دولہا بنے ہوئے دیکھتی کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا کہ نئی دلہن اس کی بے بسی پر مسکرا رہی ہے۔ کبھی اس کو یہ نظر آتا کہ اس کی سوکن ماجد کے پہلو میں بیٹھی اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہی ہے مگر کیسی ہمدردی؟ جو ایک جیتنے والے کو ہارنے والے اور قوی کو کمزور کے ساتھ ہوتی ہے

رضیہ کی اس کرب اور بے چینی کی حالت میں آخر وہ منحوس گھڑی بھی آگئی کہ ماجد میاں اپنی حماقت اور ماں باپ کے شوق سے نئی دلہن بیاہ کر لائے اور اسی حجلۂ عروسی میں جہاں رضیہ کی جوانی اس کے حسن اور اس کی آرزوؤں پر ہمیشہ کے واسطے تالا پڑا تھا اسے بھی گود میں اٹھا کر لے گئے۔ ہر چند کہ وہ اس کمرے کی حقیقت سے پوری آگاہ تھی اور جو کچھ وہاں گزرنے والا تھا جانتی تھی تاہم اس کو انتہا سے زیادہ صدمہ ہوا زہر میں بجھا ہوا ایک تیر تھا جو اس کے کلیجے میں گھستا چلا گیا لیکن قدرت کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ادھر تو رضیہ چارپائی پکڑے ساری رات تڑپتی رہی اور ادھر ماجد صاحب کی بے چینی اور بھی نرالا رنگ لائی یہ دلہن اپٹوڈیٹ تھی رضیہ کی طرح موئی مٹی سے اس کا خمیر نہ تھا۔ دولہا میاں کے خراٹوں سے اس کی نیند میں خلل آتا۔ صبح ہوتے ہوتے ساری ڈائری نصرت علی صاحب کو پہنچ گئی یہاں ابھی کانا پھوسی ہی ہو رہی تھی کہ باہر سمدھیانے کے مرد اور اندر عورتیں آموجود ہوئیں زنانے میں کوسنا پیٹنا اور مردانے میں سخت سست گفتگو شروع ہو گئی رضیہ نے اس موقع پر بھی میاں کی لاج رکھنی چاہی اور ہمخوابہ کی حیثیت سے گواہی دینے کی بے غیرتی قبول کی مگر اس حقیقت پر کون پردہ ڈال سکتا تھا دلہن کا برات کا جوڑا بھی نہیں بدلا گیا تھا اور دولہا میاں کی بدھی کے پھول بھی مرجھانے نہیں پائے تھے کہ طلاق ہو گئی طلاق تو معمولی بات تھی ہو گئی۔ میاں ماجد اور ان کے والدین کو شہر بھر میں منہ دکھانے کو جگہ نہ رہی

[illegible]

پریم کی آندھی

ہوت کی جوت والے "تارو کیا دیکھتے ہو۔ نرل چاندنی میرا دل میلا نہ کر سکی! کچھ نہ پوچھو کہ مجھ پر کیا بیتی ہے؟ کیا بیت رہی ہے اور کیا جانے کون جانے ابھی بیتنے والی ہے؟ میری کچی آنکھیں اور وہ گدرایا ہوا جوبن، میرا کمزور ہاتھ اور ان کے دامن کی مضبوط گرفت! جھوٹ بالکل جھوٹ! وہ سنبھلے ہوئے ہیں گری ہوئی۔

کئی برس کا ذکر ہے میں انجان بھولی اپنے بچپن سے کھیلتی ہوئی چمن میں پھولوں کے پودوں پر سے تیتریاں پکڑ رہی تھی۔ اکیلی، بھونروں کے سوا کوئی بھنبھنانے والا بھی نہ تھا۔ میں کیا جانوں کدھر سے وہ آ گئے اوپر سے اترے یا کسی درخت کے تھالے میں سے نکل آئے اور کھڑے کھڑے بولے کس سے بولے؟ کون جانے! میں نے آواز سنی۔ صرف آواز۔ آپ ہی آپ کہہ رہے تھے "آج یہ نیا بوٹا کہاں سے آیا۔ سارے پھول اپنا روپ کھو بیٹھے کلیوں نے چٹکنا چھوڑ دیا۔ بھونرے اودھر ہی جھکے ہوئے ہیں کوئی تارا تو ٹوٹ کر نہیں آ پڑا۔ تیتریوں کی رانی کہیں نہ آ گئی ہو۔ کس سے پوچھوں؟ زبان تالو سے چمٹی جاتی ہے۔ سانس پیٹ میں نہیں سماتا۔ دل دھڑکے جاتا ہے۔" وہ میں کیا بولتی؟ مجھ سے تو کچھ وہ کہہ نہیں رہے تھے!

پھر وہ دو قدم آگے سرک کے ہنسے اور کہنے لگے "آج تو وہ تاریخ ہے چاند کیسے

نکل آیا؟ چودھویں کا چاند ارے او دولہا بال ہیں کہ بے موسم کے بادل۔ کیاری کیاری چرنے والوں کو کیا خبر کہ بونے چلا نہیں کرتے"

میں بہری تو نہ تھی۔ سوچتی رہی کہ یہ کس سے باتیں کر رہے ہیں سمجھنے کے دن نہ تھے وہ مڑے اور اچانک بولو نہ جواب دو جاتے ہیں" کہتے ہوئے جدھر سے آئے تھے چلے گئے۔ میں اب بھی کچھ نہیں سمجھی لیکن ان کے پیچھے چلی۔ آسمان دھندلا ہو گیا تاروں نے گھونگھٹ نکال لیے۔ میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

(۲)

گرمی گرمی کے بعد برسات، برسات کے بعد جاڑا آیا۔ گاؤں میں میری شادی کی دھوم تھی۔ میرا باپ مکھی تھا۔ جہاں جمع ہوئے میں دلہن بنی منڈھا چھا گیا برات آئی کیا دیکھتی ہوں کہ وہ دولہا بنے مسکرا رہے ہیں میرے کانوں میں آواز آئی "اب کنول کی یہ کلی میرے پریم کے ساگر میں کھلے گی"

میں بالی مورکھ گاؤں کی رہنے والی، وہ جوان دھوان کالج کے پڑھے ہوئے میری بولی ان کی بولی میں فرق۔ آواز کانوں میں پڑی دل میں اتری یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کا مطلب کیا ہے اور کس سے کہہ رہے ہیں۔

انھوں نے لوگوں سے چھپ کر مجھے دیکھا۔ میرے من میں گدگدی سی ہوئی۔ میں لجا گئی وہ ہنسنے لگے۔

دل بچھڑنے کے لئے مل رہے تھے۔ صبح کو میں ان کے ساتھ جاتی رات کے اندھیرے میں جانے کیا ہوا ان کی آنکھیں بدل گئیں۔ خاصے سوئے تھے ہنستے بولتے غنودگی تھی ابھی سویرا نہیں ہوا تھا کہ میں رو دھو اجڑ گئی سنا کہ میری ناگن نے ڈس لیا۔

برات دلہن کے بدلے اپنے دولہا کی ارتھی لے کر روانہ ہوئی میں کیا روتی کس کو روتی اور کیونکر روتی وہ میرے ہوتے تو مجھ سے باتیں کرتے میری گود میں مرتے اور شمشان

میں اپنے ساتھ مجھ کو بھی لے جاتے۔

(۳)

رات دن ہونے اور دن رات ہونے کے لئے بنائی گئی ہے موسم بدلے کتنے برس یہ سمجھو کہ لڑکپن جوان ہوا جوانی ڈھلی، بجلی چمک چمک کر ماند پڑ گئی سورج نکلا اور چھپا کتنی دفعہ پھول کھلے مرجھائے اور گر پڑے مگر میرے باغ میں بہار کی رت کیا جانے کیوں نہیں آئی۔

میں سہیلی! کیا پوچھتی ہے برکھا کا جلا ہوا دکھ ہوں! بہار آتی ہے آیا کرے بسنت پھولتی ہے سدا پھولے پر اتمائے مجھ کو رستے میں اندھا کیا ہے کیا نظر آئے۔

پھلواری میں شام صبح دونوں وقت گئی آبادی کو چھانا! تالاب میں غوطے لگائے جنگلوں جنگلوں پھری۔ کہیں تو وہ بیرن ملتی! بہن سوکنا پے کا جلا پا برا ہوتا ہے اس پاپن ناگن کو بہت ڈھونڈا جس نے ان کی آنکھیں مجھ سے پھیر دیں کیا پائی؟ کسی نے اس کا کھوج نہ بتایا۔

مدتیں گزر جانے کے بعد اب بھی اپنی کیاریوں میں جاتی ہوں سب کہتے ہیں کہ اپنے کیا پرائے کہ یہ دو دھوا ہو کر باغوں میں پھرتی ہے۔ کھلتی ہوئی کلیاں ہنستے ہوئے پھول اڑتی ہوئی تیتریاں، گاتے ہوئے بھونرے کیا میرے لئے عیش کا سامان ہو سکتے ہیں؟ نہیں آہ میری سہاگن سہیلی نہیں! لوگوں کی نری تہمت ہے۔

میں باغ میں جاتی ہوں لالے کے داغ پر اپنے دل کا داغ مرجھائی ہوئی کلیوں سے اپنے من کی کلی کا مقابلہ کرنے رتوں کو آتے جاتے دیکھنے۔

میری دنیا پھر بھی نہیں مانتی۔ اچھا بہن! میں باغ میں جانا بھی چھوڑ دوں گی۔ جہاں ان کو دیکھا تھا پھولوں کی پوجا بھی نہیں کروں گی۔ پھولوں کی سہیلی میں پوجا کرتی ہوں۔ وہ آخر دم تک ان کے گلے کا ہار رہے۔

(۴)

میں نے سپنا دیکھا، یہ سارا سنسار ہی سپنا ہے۔ ہم سب کسی کا سپنا ہیں — اچھا تو سکھی میں نے ان کو سپنے میں دیکھا۔ کیا دیکھا کہ وہ میں پرے کنوئیں کی جگت کو دیکھ رہے ہیں۔

میرا انگنا اجاڑ تھا۔ پریم کی ٹھلیا پھوٹ چکی تھی۔ ٹھیکرے بھی روندن میں آکر تتر بتر ہو گئے تھے۔

آنکھ کھلتے ہی گھڑا اٹھا پانی بھرنے چلی۔ سپنا دیکھا تھا نا۔ کنوئیں کے پاس ڈھونڈل کے پانی پینے کی ضد سے لگی کھڑی تھی۔ گھاٹ خالی ہو تو جگت پر چڑھ کر ڈول ڈالتی۔ ان کے طرح طرح کے روپ میری آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ میں اپنے کو بھول گئی۔ سب پانی بھر کر چلے گئے۔ میں کھڑی کی کھڑی رہی۔ ڈول والا ڈول بھی لے گیا میں نے پانی نہیں بھرا کیسے بھرتی؟ سپنے کا سماں آنکھوں کے سامنے تھا۔ کنوئیں کے اندر سے کوئی بولا "آؤ، آ جاؤ۔ دونوں ساتھ پانی بھر کر چلیں گے" انھوں نے آواز دی تھی۔ کیسے ٹھہرتی دم سے کود پڑی۔

پانی کے بلبلوں پر ان سے باتیں کر رہی تھی کہ بیریوں نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ سن لی میری کہانی سکھی — اب مجھ کو ان کے پاس جانے اور وہ مجھے بلا۔ بے ہیں ہیں انھیں دیکھ رہی ہوں۔ کنوئیں کے باہر آ کر سب سے الگ دور ان کی برات رکی کھڑی ہے۔

سُدھانتی

یورپ کے سائنس داں بیسویں صدی کے ربع اول سے مسئلہ حیات اور روح کو حل کرنے میں کوشاں تھے ان کا خیال تھا کہ اگر کافی جدوجہد کی گئی تو بہت جلد نظام عالم کے مختلف افراد کی خلقت پر قادر ہو سکیں گے۔

ہندوستان کے بعض ماہران علوم جدیدہ بھی ارتقا کے ان مسائل پر غور کر رہے تھے کہ سنہ ۱۹۰۲ء میں ایسوسی ایٹڈ پریس نے ایک نہایت تعجب انگیز اور سنسنی خیز خبر شائع کی کہ مدراس کے مشہور محقق ڈاکٹر آر Iyer نے ہر قسم کے جانداروں کی ابتدائی صورت تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور عنقریب وہ اپنی مصنوعات کی نمائش کرنے والے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف اپنی سائنٹفک تحقیقات اور علمی معلومات کے لیے ہندوستان کے ہر حصہ میں پوری شہرت رکھتے تھے اور ان مسائل میں آپ کا نام کافی اعتماد رکھتا تھا۔ تاہم اس خبر کو تعلیم یافتہ طبقہ نے انتہائی بے اعتباری کے ساتھ پڑھا اور باوجود سائنس کے سینکڑوں معجزے دیکھنے کے چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

دنیا میں اخبارات کے ایڈیٹر اپنی ذہنیت کے لحاظ سے ایک عجیب مخلوق ہے۔ ان کے خیالات کی پرواز ہی نرالی ہوتی ہے۔ چنانچہ دہلی کے انڈین پریس کے مالک نے اپنے ایک ہوشیار نمائندے کو مدراس جا کر ڈاکٹر صاحب کی ان علمی تحقیقات

کے متعلق مزید حالات دریافت کرنے پر رضامند کیا۔

مسٹر کشور جو نہایت قابل مضمون نگار اور سائنس کے طالب علم تھے بڑے شوق سے روانہ ہوئے مدراس پہنچ کر ڈاکٹر آرٔر کی نسبت مقامی پریس کی رائے معلوم کی اور ان کے مکان پر جا پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی لیبوریٹری میں تھے کارڈ پہنچا۔

ڈاکٹر آرٔر جن کی عمر پچاس باون سال کے قریب ہوگی نہایت ذہین اور حد درجہ کے خلیق انسان تھے، انھوں نے کارڈ دیکھا " ایم کشور شاستری۔ طالب علم سائنس کچھ سوچا" اچھا یہیں لے آؤ۔"

معمولی علیک سلیک کے بعد مسٹر کشور نے ڈاکٹر صاحب کی تحقیقات سے دلچسپی کا اظہار کیا اور کہا کہ اسی شوق میں دہلی سے مدراس تک پہنچا ہوں۔

ڈاکٹر" مبارک ہیں بھارت ماتا کے وہ سپوت جن کو علم کی پیاس ہو۔ میں کوشش کروں گا کہ تم میری تحقیقات سے کافی معلومات بہم پہنچاؤ" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے دوستانہ طریق پر مسٹر کشور کا ہاتھ پکڑا اور شیشے کی الماری کی ایک لمبی قطار دکھائی" یہ میری تحقیقات کی دنیا کا پہلا منظر ہے" ان الماریوں میں بہت سے خانے تھے اور ہر خانہ میں مختلف قدوقامت کے اور مختلف صورت و شکل کے چھوٹے چھوٹے جانور اپنی اپنی زندگی کے لئے کشمکش کرتے دیکھے۔ مسٹر کشور نے حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیا یہ بالکل انسانی صنعت ہے؟"

ڈاکٹر مسکرایا اور بولا" بالکل انسانی مسٹر کشور۔ یہ سائنس کے میدان کی پہلی دوڑ ہے"

"تو آپ اس دنیا کے خالق ہیں؟ اللہ اللہ انسان میں بھی کیا قدرت ہے!"

ابھی شاید تم نے علم کی طاقت پر غور نہیں کیا؟"

مسٹر کشور نے ڈاکٹر کی ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے پوچھا" آپ نے سب سے بڑا جانور کون پیدا کیا ہے؟"

اس کا انھوں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ مسکراتے ہوئے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

چند قدم چلنے کے بعد ڈاکٹر نے دبی زبان سے مسٹر کشور کے کان میں کہا "میں تمہیں ایک بالکل نئی چیز دکھاتا ہوں۔ مگر تم اس بات کا اقرار کرو۔ عہد استوار عہد کہ تم اس کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے" کشور نے دھڑکتے ہوئے دل سے جواب دیا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی صنعت گری کا یہ راز بالکل راز رہے گا۔"

اب لیبوریٹری کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے تھے یہاں لمبی لمبی میزوں پر صندوقیں اور صندوقچیوں کی قطاریں دکھائی دیں۔ کمرہ کے وسط میں ایک بڑی مربع میز پر چند اس قسم کی نلیاں۔ سلنڈر اور آلات موجود تھے جن کے لیے اردو زبان میں ابھی تک نام بھی ایجاد نہیں ہوئے تھے دیواروں میں جابجا خانے بنے ہوئے تھے اور ان خانوں میں قطار در قطار چھوٹی بڑی بوتلیں اور سائنس کے متعلق مختلف کلیں سجی ہوئی تھیں ایک سرخ لیمپ کی روشنی تھی جو چھت میں آویزاں تھا اور ہوا میں اس قسم کی بو تھی جیسی تیز عرقوں کو جوش دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کہنے لگا یہ میری لیبوریٹری کا خاص حصہ ہے بہت کم لوگوں کو اس کے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ اس محفل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو یہ کہہ کر ڈاکٹر نے ایک شیشے کے بکس کا ڈھکنا اٹھایا۔ سائنس کی کرشمہ سازی ملاحظہ ہو۔ مسٹر کشور نے اندر نگاہ کی تو اس میں عورت کی رحم کے شکل کا تربوز کے برابر ایک تھیلا پڑا تھا۔ اس تھیلے کو ایک لچک دار نلی کے ذریعے سے ایک لمبے سرخ سلنڈر کے ساتھ جوڑا گیا تھا جس میں برقی تار لگے ہوئے تھے اس کے اندر دل کی طرح باقاعدہ حرکت ہو رہی تھی اس کے سوا اور کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ مسٹر کشور کو جب اس معمہ کے حل کرنے میں ناکامی رہی تو اس نے کہا "کیا آپ اس کی تشریح کریں گے؟"

ڈاکٹر تھوڑی دیر خاموش رہا۔ وہ مسٹر کشور کی سمجھ سے مایوس تھا یا اپنی ذہانت کے اثر کو دوبالا کرنے کی خواہش تھی۔ پھر بولا "جو کچھ میں کہنے کو ہوں تم اسے شاید باور نہ کر سکو۔ سائنس کی ایجادات ابتدا میں ہمیشہ بعید الفہم ہوا کرتی ہیں" اس کے بعد وہ پھر اس طرح رک گئے گویا اس کے خیالات ٹٹول رہے ہیں۔ مسٹر کشور نے اطمینان سے لہجہ میں جواب دیا "ڈاکٹر صاحب! میرے دل میں آپ کا بڑا احترام ہے" آپ جو کچھ کہیں گے میں اسے صحیح تسلیم کر لوں گا۔ علم جب عملی صورت اختیار کر لیتا ہے تو یقین کر لینا ہی پڑتا ہے"

ڈاکٹر نے کچھ کہنے سے پہلے کارڈیو میٹر سے اس کی حرکات گنیں پھر اس پر ایک آلہ لگایا جو دل کی حرکات معلوم کرنے سے کسی قدر مشابہ تھا۔ بعد ازاں مسٹر کشور کی طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھا اور اس چیز کی جانب اشارہ کر کے کہا "یہ ایک مصنوعی بچہ ہے سائنس کی جدوجہد کا انتہائی مرحلہ"

مسٹر کشور کا یہ سن کر سر چکرا گیا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا "کیا؟ انسان کا بچہ؟"

"ہاں! انسان کا بچہ۔ بالکل ایسا ہی جیسے مرد اور عورت پیدا کر سکتے ہیں؟"

"پھر تو آپ سائنس کی دنیا میں خدائی کریں گے"

ڈاکٹر کا چہرہ زیادہ سنجیدہ ہو گیا اور اس نے مسٹر کشور کی حیرت کا موازنہ کرتے ہوئے کہا "میری زندگی کا مقصد یہی ہے کہ مصنوعی انسان پیدا کر سکیں۔ میں نے اپنی دولت، اپنی صحت اور کوششوں کا تمام سرمایہ اسی ایک خیال کی نذر کر دیا ہے۔ اگر میں اس میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً مجھ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی شہرت اور خوشی کا مالک نہ ہوگا۔

"واقعی اس سے زیادہ شہرت کیا ہو سکتی ہے"

یہی نہیں بلکہ اس طریق پر انسان کی پیدائش کے یہ معنی ہوں گے کہ میں آئندہ جسم کے اندر اعلیٰ درجہ کے احساس پیدا کر سکوں گا۔ میرے بچہ میں بہترین ذہانت ہوگی۔ اس کے اعضا بھی ایسے بناؤں گا جو ارتقا کی بدولت بھی اب تک حاصل نہیں ہوئے۔

مسٹر کشور کی نگاہیں ڈاکٹر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ششدر اس کی تقریر سن رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "مسٹر کشور اس بات کو یاد رکھو کہ میں جو انسان پیدا کرنا چاہتا ہوں اس کے متعلق میری آرزو ہے کہ اس کی پیدائش میں کسی قسم کا حیوانی مادہ نہ برتا جائے۔ ہر چیز یہاں تک کہ وہ جوہر لطیف بجائے خود اس کی پرورش کرتا ہے بناوٹی رس ہے۔ ہمارے رشی منی گھاس کے پتلوں میں جان ڈال دیا کرتے تھے کیا ہم اس دور علم و عمل میں اتنا بھی نہ کر سکیں گے؟"

مسٹر کشور نے اس رحم نما تھیلے کی طرف جو نہایت باقاعدگی کے ساتھ حرکت کر رہا تھا اشارہ کر کے پوچھا "کیا یہ آپ کی پہلی کوشش ہے اور کیا اس میں حسب دلخواہ کامیابی کی امید ہے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا "پہلی کوشش نہیں۔ ہزاروں ناکام تجربوں کے بعد یہاں تک نوبت پہنچی ہے ...... اب تک سارا کام بڑی خوش اسلوبی اور صحیح نتائج کے ساتھ سرانجام پا رہا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ چھ مہینے کے عرصہ میں بچہ پیدا ہو جائے گا۔ موجودہ حالت میں یہ تخم چھ پونڈ وزنی بچہ کے برابر ہوگا۔"

مسٹر کشور کی عجیب حالت تھی۔ اس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ کے اندر کوئی مافوق الفطرت طاقت ضرور ہے۔ مغربی دنیا آپ کی اس ایجاد کا ذکر سن کر کیا کہے گی؟ لیکن آپ یہ تو فرمائیے کہ اس کے اندر دماغ بھی ہوگا اور اس مصنوعی انسان کی شکل و صورت کیسی ہوگی؟"

ڈاکٹر نے تیوری چڑھائی۔ مسٹر کشور کو گھورا اور حقارت آمیز لہجہ میں بولے۔۔

"کیسا نامعقول سوال ہے۔ تمہارے حواس کیوں باختہ ہو گئے۔ دماغ اور شکل تو ایک طرف میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے میں وہ تمام باتیں موجود ہوں جو موجودہ نسل انسانی میں معدوم ہیں وہ ایکس رے شعاعیں، مقناطیسی لہریں ہپناٹزم اور روحانیت کی موجیں نظروں سے پوشیدہ عالم اور ان کے موجودات سب کو دیکھ سکے وہ ہوا میں پرندوں اور پانی میں مچھلیوں کی طرح اڑ اور تیر سکے وہ تمام اسرار قدرت سے واقف ہو۔"

مسٹر کشور نے بڑھتے ہوئے استعجاب کو ضبط کرتے ہوئے کہا:۔

"سائنس باوجود کوششوں کے اب تک نیند اور خواب کے نظریات کا پتہ چلانے سے قاصر ہے لیکن آپ ......"

"ہاں! ہاں میرا بچہ ان تمام کمالات کا مظہرہ ہوگا" ڈاکٹر نے یہ الفاظ بڑی سنجیدگی سے کہے ان کے چہرہ پر اس قسم کا فلسفیانہ اطمینان تھا کہ مسٹر کشور اپنے سوال پر شرمندہ سا ہو گیا۔ اتنے میں ڈاکٹر نے ایک اور پوشیدہ سلنڈر نکالا۔ اس چھوٹے سے شیشہ کے آلہ میں ایک چھوٹا سا بندر اچھلتا کودتا نظر آیا۔ یہ بندر دو انچ سے بڑا نہ تھا اس کی چار آنکھیں اور چار ہی کان تھے ان کے علاوہ اس میں بعض ایسے اعضا بھی پائے جو اور کسی حیوان میں نہیں دیکھے گئے۔ ڈاکٹر نے مسٹر کشور کے چہرے سے اس کی حیرت کا اندازہ کر کے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"چین میں جو بونے درخت ہوتے ہیں انہی کے اصول پر میں بونے بندر بھی پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جانور اگرچہ قطعاً مصنوعی نہیں ہے تاہم اس میں بہت کچھ میری صنعت کو دخل ہے"۔

مسٹر کشور نے سوال کیا:۔

"ڈاکٹر صاحب معاف کیجیے گا۔ کیا دنیا میں اس قسم کی مخلوق بھی موجود ہے جس کا سائنس والوں کو پتہ نہیں"

انھوں نے جواب دیا " لا انتہا تعداد میں ! اگر ہم ان سے واقف نہیں تو قصور صرف ہمارا ہے۔ قدرت نے ہمیں ان اعضا سے محروم رکھا ہے جن کی مدد سے ہم انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ میں اپنے علم کی بنا پر پریوں فرشتوں، جنوں بھوتوں اور ارواح خبیثہ اور لطیفہ کے وجود کا قائل ہوں۔ یہ بندر جسے تم دیکھ رہے ہو۔ ایکس رے شعاعیں اور مادیت کے ہر وجود کو دیکھ سکتا ہے۔ اس قسم کی ساری صفات بلکہ اس سے زیادہ اس لڑکے میں ہوں گی جس کو میں مصنوعی طور پر پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ بڑا ہو کر ہمیں نامعلوم عالموں اور ان میں بسنے والی مخلوقات کے متعلق بہت سی عجیب و غریب باتیں بتا سکے گا۔ اور اسی لئے میں نے اس کا نام سدرشن تجویز کیا ہے۔

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں لیبورٹری سے باہر آئے اور مسٹر کشور عجائبات سے لبریز دماغ اور نئی نئی دریافتوں کا ذخیرہ لئے ہوئے ڈاکٹر آر سے رخصت ہوئے مسٹر کشور نے جو ڈاکٹر آر کی لیبورٹری میں دیکھا تھا اگر رات کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا تو یقیناً خواب پریشان سمجھتا۔ لیکن اس نے مصنوعی بچہ کو اس کی ابتدائی حالت میں دن کے وقت خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ڈاکٹر کی شہرت ہندوستان میں باعتبار ایک محقق سائنس کچھ کم نہ تھی اس لئے مسٹر کشور کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ ڈاکٹر کی باتوں پر یقین کرتا اور جو کچھ دیکھا تھا اسے بالکل صحیح سمجھتا۔

دہلی واپس آکر مسٹر کشور نے ڈاکٹر آر سے ملاقات اور اس کے کارناموں کا مختصر سا خاکہ اخبار کے لئے لکھا لیکن اس معرکہ کی بات کو عمداً چھوڑ دیا جس کو پوشیدہ رکھنے کا وعدہ کر آیا تھا۔ کئی مہینے کے بعد ڈاکٹر کا ایک خط مسٹر کشور کے نام آیا۔ میں نے مدراس سے نقل مکان کر کے کولمبو میں رہائش کا انتظام کر لیا ہے اور جب تک میری دریافت مکمل نہیں ہوگی غالباً میں یہیں رہوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں کہ ہر نئی بات کی آپ کو برابر اطلاع ملتی رہے گی۔"

اس کے بعد کئی سال گذر گئے۔ ڈاکٹر کو کوئی خط نہیں آیا جتنے خط مسٹر کشور نے لکھے وہ سب لاپتہ ہو کر واپس آ گئے۔ شوق سے بیتاب ہو کر ایک مرتبہ مسٹر کشور کولمبو بھی گئے۔ لیکن جب وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ چند ہفتے ہوئے وہ چین و جاپان کی سیاحت کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔ مسٹر کشور کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اپنے شوق کا ماتم کرتے ہوئے دہلی آئے اور گذشتہ تمام واقعات کو ایک مقناطیسی خواب سمجھ کر خاموش ہو گئے۔

مدراس میں ڈاکٹر آئرے سے ملاقات کئے اور ان کی جادوگری کا تماشا دیکھے ہوئے بیس سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ مسٹر کشور نے ڈاکٹر کی کامیابی کی توقع دل سے بھلا دی تھی کہ ایک روز مسٹر کشور اپنے دفتر میں بیٹھے کسی خیال میں سگریٹ پی رہے تھے ایک خوب صورت نوجوان اندر داخل ہوا اور مسٹر کشور کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ دے کر خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ خط میں لکھا تھا:۔

"میرے عزیز دوست! حامل ہٰذا میرا بیٹا "سدھانتی" ہے۔ جو تعلیم کی غرض سے دنیا بھر کا سفر کر رہا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ تمہیں بہت سی عجیب و غریب باتیں سنائے گا اور تم کو اس کی شخصیت سے یقیناً دلچسپی ہوگی۔ اگر تم کسی طرح اس کی مدد کر سکے تو میں ممنون ہوں گا۔

تمہارا صادق

ایچ۔ ایچ۔ آر۔

خط پڑھ کر مسٹر کشور کا دماغ چکرا گیا۔ خوشی اور استعجاب نے اس کو مبہوت کر دیا۔ اس نے دوبارہ نوجوان کے خوشنما سڈول جسم اور خوب صورت چہرہ کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مسٹر کشور

اپنے جذبات پر قابو پانے کے لئے عالم تجربہ کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گئے اور دل ہی دل میں سوچنے لگے۔ ڈاکٹر آر می ہندوستان کا ایڈیسن ثابت ہونیوالا ہے۔ آخر اس نے مصنوعی انسان پیدا کر ہی لیا۔ کیسا دجیہ اور کس قدر نظر فریب۔

چند سکنڈ بعد مسٹر کشور نے نوجوان سے کہا:۔

"جب تک آپ دہلی میں رہیں میری مہمانی قبول فرمائیے میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں"

اس نے مسٹر کشور کی درخواست پر کوئی اعتنا نہیں کیا بلکہ اس نے کہا:۔ میں نے ایک افسانہ لکھا ہے۔ کسی اچھے اخبار یا رسالہ میں شائع کرانا چاہتا ہوں۔ اس کا عنوان "دوسرے عالموں کی روحوں سے میری ملاقات" ہے۔ کیا آپ اس کا انتظام کر سکتے ہیں؟"

نوجوان کی اس بات نے مسٹر کشور کے یقین کو اور بھی پختہ کر دیا۔ اس لئے کہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ "میرا پیدا کیا ہوا بچہ ان سب باتوں سے واقف ہوگا جو ہمارے لئے اسرار ہیں" مسٹر کشور نے جلدی سے گھبرا کر پوچھا "آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ ضرور حقیقی تجربہ کی بنا پر لکھا ہوگا" نوجوان نے جواب دیا:۔

"یہی سمجھنا چاہیئے کیونکہ جو بات ہم فرض کر لیتے ہیں وہ حقیقی تجربہ کے برابر ہی درجہ رکھتی ہے۔ تمام اکتشافات دراصل انسانی ذہن ہی کی پیداوار ہوتے ہیں" مسٹر کشور نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ درست کہتے ہیں۔ لیکن اخبار یا رسالہ کے ایڈیٹر معاملہ کو اس نقطہ نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کے تبصرہ کا زاویہ دوسرا ہوتا ہے" وہ بولا "کچھ مضائقہ نہیں۔ میں اپنے قصہ کو ان کے مذاق کے مطابق بنا کر لایا ہوں۔ اس میں اگر اور خوبی نہیں تو اصلیت ضرور ہے علاوہ ازیں میرے والد کی شہرت اس کو کامیاب بنانے کے لئے کچھ کم نہیں"

مسٹر کشور بڑے غور سے نوجوان کی طرف دیکھتا رہا دل میں سوچا "یہ آدمی ہے یا طلسم راز ؟"

مگر بظاہر صرف اس قدر کہا منہ سدھانی: آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے۔ اس صورت میں تو جو کچھ بھی آپ لکھیں گے ہر ایڈیٹر اس کے چھاپنے کو تیار ہو گا آپ کے پاس اس قصے کا مسودہ تیار ہے ؟"

نوجوان نے مسودہ نکال کر کشور کے سامنے ڈال دیا اور کہنے لگا۔ اس میں اعلیٰ اور اسفل دونوں عالموں میں میری سیاحت کا ذکر ہے "

مسٹر کشور نے مسودہ کے ورق کھولے اور پڑھنا شروع کیا۔ لکھا ہوا تھا:۔

" . . . . . اور بہشت اور دوزخ کی کوئی شکل اور صورت نہ تھی روشنی اور تاریکی زمانہ کی سطح پر ملی ہوئی تھیں۔ انسان کی روح تصور کی ہوا میں مست تھی تخیل کی فضا میں کوئی وجود موجود نہ تھا۔ فطرت کے ظہور کی گونج تھی مگر اس میں حصہ لینے والا کوئی موجود نہ تھا۔ انسان نے خواہش کی کہ اس میں نیکی اور بدی پیدا ہو۔ ایسا ہی ہوا۔ پھر خواہش کی کہ اس کی نمائش کی جائے اور جنت اور جہنم سامنے آ گئے۔ کرۂ ہوائی اپنے اندر اعمال کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے۔ ہر عمل ظاہر میں ختم مگر در اصل ہوائی اوراق میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہر آواز برقی رَو کے ذریعہ ہوا میں پہنچا کر پھر سنی جاتی ہے اسی طرح حرکات بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ انسان اس مادی زندگی سے گزر کر جب اپنی اصلی زندگی شروع کرے گا تو جو کچھ اس نے یہاں کیا ہے وہ پھر سامنے آ جائے گا۔ وہی عذاب و ثواب ہے اور اس کی مجموعی صورت کا نام بہشت اور دوزخ ہے "

مسٹر کشور مسودہ پڑھتے پڑھتے یکایک رک گیا اور نوجوان کی طرف دیکھنے

لگا۔ وہ ایک اخبار پڑھ رہا تھا۔ مسٹر کشور نے پوچھا۔

"یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے بہت ہی سوچ سمجھ کر لکھا ہے کیونکہ اب زمانہ کے لوگ ایسی باتیں باور کرنے کے لئے فوراً تیار نہیں ہوتے" نوجوان نے شانہ ہلا کر جواب دیا۔

"اگر آپ ایک ایسے انسان کی صورت اختیار کر سکیں جس کو فطرت نے اس بات کی اجازت دی ہو کہ انقلاب اور زمانہ سے بالاتر ہو کر ان عالموں میں جو نظروں سے غائب ہیں پرواز کر سکے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ حقیقت جس پر زمانۂ موجودہ کے لوگوں کو فخر ہے محض ایک اصلاحی گورکھ دھندا اور مسخرہ ہے۔"

مسٹر کشور نے سر ہلایا اور مسودہ کو پھر پڑھنا شروع کیا۔

"عالم ارواح کے سفر کی ہر منزل۔ مختلف قسم کے مسافروں سے آباد تھی مگر یہ اختلاف اضافی تھا۔ یہ مسافر کچھ پستی کی طرف جا رہے تھے اور کچھ بلندی کی جانب۔ آگے بڑھا تو حد نظر تک سبزہ زار ہی سبزہ زار تھا۔ جا بجا پر امن فرود گاہیں تھیں۔ ہوا کے سمندر میں بڑے بڑے عالیشان بجرے خوشگوار ترنم کے ساتھ تیر رہے تھے۔ غور سے دیکھا تو جامد محلات اور یہ متحرک بجرے ذی روح کرتے ہیں۔ جن کو لوگ ستارے اور سیارے کہتے ہیں۔ فضا کے اندر تسکین بخش موسیقی کے نغمے اس طرح سنائی دیتے تھے جس طرح موسم بہار کی آمد پر خوش گلو پرندوں کے چہچہے یہ وہی آوازیں تھیں جو حسن و عشق کے تصادم سے پیدا ہوکر ہوا میں گونجتی ہیں اور جن کو معمولی مادی انسان نہیں سن سکتا ہر طرف حسن ہم آہنگی۔ صحت اور خوشی کا راج تھا۔ یہاں کے رہنے والے خیال کی پاکیزہ صورتوں کے نمونے اور نور کی تصویریں تھیں۔ زبانوں کے بدلے ان کے دل بولتے تھے

اور آواز کی جگہ کلام کی صورت بن کر سامنے آجاتی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ کیا اچھا ہو اگر مجھ کو یہاں رہنے کی اجازت مل جائے۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی ایک مست خرام کا دل مہتاب کی طرح روشن ہو گیا اور اس میں نورانی لہروں نے نکل نکل کر میری آنکھوں کے سامنے یہ عبارت لکھ دی۔

"تم کو پہلے دنیا تیاگ کرنا ہوگا۔ جب تک تم دولت یا خواہشات نفسانی کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہو یہاں نہیں رہ سکتے" یہ دیکھتے ہی میں اپنی ہستی کو بھول گیا اور ہوا کے ایک لطیف جھونکے کے ساتھ ایک دوسرے عالم میں جا پہنچا۔ یہاں ہماری دنیا سے زیادہ چہل پہل تھی۔ بغض و حسد کا دور دورہ تھا فریب و دغا قانون میں داخل تھے۔ ریل کے انجنوں میں سیاہ کاری کا کوئلہ جھونکا جا رہا تھا۔ موٹریں صداقت کے خون سے چل رہی تھیں ہوائی جہازوں کے پنکھے ہوا کو زہریلی بنا رہی تھی انبوہ در انبوہ مخلوق چلتی پھرتی نظر آئی۔ ظاہر آراستہ اور باطن گندے۔ دیکھنے میں شاندار اور فیشن ایبل مگر ضمیر مردہ۔ باتوں میں فساد کی بو اور حرکات میں ریاکاری کا رنگ۔ حسن تھا تو ایمان کا دشمن۔ عشق تھا تو عصمت کے خون کا پیاسا۔ اس عالم کی سیر سے بہت جلد میرا جی گھبرا گیا اور میں یہاں سے نکلنے کا راستہ معلوم کرنے کے لئے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک سپاہی نے ڈانٹ کر پوچھا "کیا جیب کترنے کے لئے کسی مالدار کی تلاش میں ہے۔ میں نے دو بدو جواب دیا "تم نے جیب کترنے کی کیا علامت دیکھی جو اس طرح مجھ پر اتہام دھرتے ہو" اس نے اسی لہجہ میں کہا "بدمعاش اپنی وضع تو دیکھ۔ تیرے جیسے پردیسی ہمیشہ چور ثابت ہوتے ہیں" اتنے میں ایک ٹیکسی میرے قریب سے گذری میں نے اس کو روکا اور یہ کہتا ہوا اس میں بیٹھ گیا کہ "جہاں اس شہر کی میونسپل حدود ختم ہوتی

ہلیا وہاں لے جاکر چھوڑ دو ۔"

اس کے بعد جب میں نے دوبارہ اس دنیا کا رخ کیا تو معلوم ہوا کہ میرا خاکی جسم مدت ہوئی جلا دیا گیا ہے ۔ ناچار ایک نئی ہستی کی مختلف منزلیں طے کرنے کی تیاریاں کرنے لگا اور جب میں دنیا میں نمودار ہوا تو جسم ۔ فرائض ۔ ماحول وغیرہ ہر چیز نئی نظر آئی ۔ لیکن اس کا مجھے پورا علم تھا کہ میری روح وہی ہے ۔"

مسٹر کشور جب اس قصے کو پڑھ چکے اور نظر اٹھائی تو دیکھا نوجوان کھڑکی میں کھڑا ہوا سورج کو غروب ہوتے دیکھ رہا تھا ۔

"عزیز من یہ ایک غیر معمولی طور پر دلچسپ مضمون ہے لیکن واقعات اس قدر عجیب ہیں کہ اگر اس کے لکھنے والے آپ نہ ہوتے تو منتظر کے پیچھے سراغ رساں چھوڑنے پڑتے ۔ لیکن اس مضمون میں کچھ اجمالی باتیں ہیں جن کی تفصیل کی ضرورت ہے ۔ آئندہ تشریح کی روشنی ڈال کر اس سلسلہ کو جاری رکھنا پڑیگا

وہ ہنسا ۔ کیا آپ اس اتہ اکو انتہا سمجھتے ہیں ؟"

"معاف کیجئے میں نے اپنی رائے کے اظہار میں جلدی بازی سے کام لیا ۔" یہ کہہ کر مسٹر کشور سنبھل کر کرسی پر بیٹھے اور دل میں سوچنے لگے کہ میرے لئے اس شخص کی بدولت ۔ دولت اور شہرت حاصل کرنے کا کیسا اچھا موقع ہے ۔ورنہ ماہ مستقبل کے متعلق طرح طرح کی تجاویز کا سبز باغ لگانا شروع کر دیا ۔ اس نے ارادہ کیا کہ اخبارات میں اس مضمون کا نوٹ چھپوا دوں ۔ کہ میرے پاس دور حاضرہ کا "کشن" ٹھہرا ہوا ہے جو ماں کے بطن سے پیدا نہیں ہوا سائنس کا بچہ ہے ۔ لوگ جس وقت مسلم ۔ ہندو ۔ انقلاب وغیرہ چوٹی کے اخباروں میں اس کا ذکر پڑھیں گے تو ہر ایک میری ملاقات کا خواہش مند ہوگا ۔ بعض اسے بلے وقت کا اپریل فول ہی سمجھیں گے لیکن میری عینی شہادت تمام

مشتبہات کو دور کر سکتی ہے۔"

اس قسم کے خیالات کو دل میں لیے ہوئے مسٹر کشور اٹھے۔ نوجوان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور کہا "کل میں ملک کے بڑے بڑے ایڈیٹروں لیڈروں اور عجائب پرست احباب کو آپ کی ملاقات کے لیے دعوت دوں گا۔ نامور ہستیوں کو روشناس کرانے کا یہی طریقہ ہے۔" نوجوان رخصت ہوا۔

تیسرے روز علی الصبح دار الحکومت کے تمام اخبارات کے قائم مقام اور بہت سے خوش باش لوگ مسٹر کشور کی ملاقات کو آئے۔ مسٹر کشور نے انھیں ان واقعات سے باخبر کیا جو بیس سال قبل اس نے ڈاکٹر آرر کی لیبرریٹری میں معائنہ کیے تھے اپنے بیان کی تصدیق میں مصنوعی جانوروں اور جنین کے فوٹوگراف بھی دکھلائے اور وہ خطوط بھی پیش کیے جن میں ڈاکٹر آرر نے اپنی اس ایجاد کا اشارۃً ذکر کیا تھا۔ اس لیے ان سب کو مسٹر کشور کی باتیں ماننی پڑیں۔

نوجوان سد حانتی سے عام ملاقات کے لیے اتوار کا دن مقرر ہوا جو تیسرے روز آنے والا تھا اور ساتھ ہی ایک معقول فیس بھی طے کر لی گئی۔ چنانچہ اس مضمون کے تار تمام اخبارات کو بھیجے گئے۔ دوسرے دن سے اخبارات میں اس نوجوان کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ چھپنا شروع ہو گیا۔

اتوار آئی۔ صبح ہوئی۔ سد حانتی شاید ابھی بیدار بھی نہ ہوا ہوگا کہ مسٹر کشور کے ہاں مختلف لوگوں کی طرف سے آئے ہوئے تاروں کا انبار لگ گیا۔ بعض نے اس روز کی آمدنی کا ٹھیکہ لینا چاہا تھا۔ بعض اس بارے میں مزید کیفیت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ بعض نے ہوائی جہاز کے ذریعہ پہنچنے کی اطلاع دی تھی اور بعض خاص طور پر خلوت میں ملاقات کرنے کے آرزومند تھے اور اس کے لیے اچھی اچھی رقمیں پیش کی تھیں۔

سدھانتی کا لکھا ہوا قصہ بھی کئی اخباروں میں چھپ چکا تھا مسٹر کشور جب ہوٹل میں پہنچے جہاں یہ نوجوان مقیم تھا تو لوگوں کی اس قدر کثرت تھی کہ راستہ چلنا دشوار تھا۔ اخبارات کے ایڈیٹروں۔ نمائندوں اور رپورٹروں کے علاوہ بڑے بڑے مال دار۔ مارواڑی سوداگر۔ ڈاکٹر۔ پروفیسر۔ لکھ پتی رئیس خطاب یافتہ ہندو مسلمان۔ اعلیٰ طبقے کے انگریز۔ لیڈیاں۔ پارسی۔ مرہٹے گجراتی بنگالی خواتین غرضکہ ہر عمر۔ ہر جنس اور ہر رنگ کے آدمی جمع تھے۔ اتنی جگہ نہ تھی کہ گذر کر اس عالمہ میں کی خبر اس کے اصل ہیرو کو دی جا سکتی۔

آخر بدشواری مسٹر کشور اس بھیڑ کو چیرتے ہوئے اس کے کمرے میں پہنچے۔ وہ بیدار ہو چکا تھا اور کپڑے پہن رہا تھا۔ مسٹر کشور نے صبح کا ایک اخبار اس کے ہاتھ میں دے کر کہا:۔

"مسٹر سدھانتی ذرا اسے دیکھنا" اس نے ایک مضطربانہ انداز سے اخبار پر نظر ڈالی۔ سرخیاں پڑھیں اور اس کے بعد اپنے متعلق مضمون پڑھا۔ جوں جوں وہ اس مضمون کو پڑھتا تھا اس کے اضطراب میں ترقی ہوتی جاتی تھی۔ آخر سطروں پر پہنچ کر اس کی پریشانی کی انتہا نہ رہی رنگ زرد ہو گیا ہاتھ کانپنے لگے اور سر کرسی کی پشت سے جا لگا۔ مسٹر کشور نے یہ حالت حد درجہ کی بے چینی کے ساتھ دیکھی۔ حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا ہوا۔ خیر تو ہے۔ آپ بیمار تو نہیں ہیں؟"

نوجوان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے جواب دیا:۔

"غضب ہو گیا۔ اف میرے خدا اب کیا ہوگا؟" مسٹر کشور ان الفاظ کو سن کر اور گھبرا گئے اور انھوں نے کہا آپ کیا کہتے ہیں" اس میں قابل اعتراض

کونسی بات ہے؟

اس نے ایک اندوہناک چیخ ماری اور سر کے بال نوچتے ہوئے کہا:۔

"یہ جو کچھ لکھا ہے سرتاپا جھوٹ ہے یہ اخبار جب میرے والد کی نظروں سے گذرے گا تو وہ کیا کہیں گے۔ خدا ان اخبار والوں کے ہتھکنڈے سے بچائے۔ اف!"

مسٹر کشور اب بھی نہ سمجھے اور کسی قدر زور دے کر بولے:۔

"آپ خواہ مخواہ گھبراتے ہیں۔ میں اس خوف کے معنی نہیں سمجھتا۔ اس ملاقات کی کیفیت میں کونسی بات جھوٹی درج ہوئی ہے"

نوجوان اپنے جذبات کی بے پناہ کش مکش سے تنگ آچکا تھا جھنجلا کر کہنے لگا "آپ سے ایک خوفناک غلطی ہوئی ہے بیحد خوفناک!"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ میں مصنوعی انسان نہیں ہوں" اتنا کہہ کر وہ گھبراہٹ کی حالت میں کھڑا ہو گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں پھر بولا "آپ کو یہ گمان کیونکر پیدا ہوا کہ میں مصنوعی انسان ہوں"

مسٹر کشور کی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ آگیا اس نے بے انتہا ضبط سے کام لیا اور پوچھا۔

"تو یہ! تو یہ کیا تمہارا نام سدھانتی نہیں ہے؟ بیس سال ہوئے تمہارے والد نے مدراس میں مجھے رحم کی شکل کا ایک تھیلا دکھایا تھا۔ کیا تم اس سے پیدا نہیں ہوئے؟"

ایک از خود رفتہ دیوانہ کی طرح اس نے اپنا منہ پیٹ کر جواب دیا:۔

غضب! غضب میں تو اپنے باپ کا قدرتی بیٹا ہوں اور اس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ کولمبو میں رہتے تھے وہ جنین بڑھتے بڑھتے آخر غلاظت کا ایک ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا۔" مسٹر کشور چکرا کر دیوار سے جا لگے اور پوچھا تم اپنے باپ کے قدرتی بیٹے ہو اور سائنس کی کرامت کا انجام غلاظت کا ڈھیر ہوا۔ کیا سچ کہتے ہو؟"

"میرے پاس اس کے بیسیوں ثبوت مہیا ہیں اسے روز روشن کی طرح ثابت کر سکتا ہوں۔ اف! میرے خدا اب کیا ہوگا۔ اے ستم ظریف اخبار نویس تو نے یہ کیا کیا۔" یہ دونوں قدرتی انسان سائنس کے فریب میں مبتلا کمرہ میں دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر چھپتے پھر رہے تھے بار بار ٹیلیفون کی گھنٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور ملازم ہر منٹ کے بعد مٹھیاں بھر بھر کر ملاقاتی کارڈ اندر ڈال رہا تھا مگر ان دونوں کو کچھ خبر نہ تھی۔

حافظ سلیم

دلی میرا آبائی وطن ہے۔ وہیں میں پیدا ہوا۔ والدین کیا سارا کنبہ غریب تھا مگر بے داغ، اجلے پوش، اپنی راہ چلنے والے، ملازمت پیشہ تھے۔ ابھی دودھ چھٹنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ ماں کی گود سے خدا نے محروم کر دیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دودھ چھٹا اسی بجوگ میں کہ وہ بیمار ہو گئیں۔ والد پردیس میں ایک ریاست کے نوکر۔ نوکری کرتے یا مجھے پالتے۔ قریب کے رشتہ داروں میں ایک خالہ تھیں بے اولاد۔ ان کے سپرد کر دیا۔ خدا نے میری پرورش کا سامان تو کر دیا لیکن پھوٹی ہوئی قسمت کا کیا علاج۔ ابھی بسم اللہ کے گنبد میں تھا کہ والد کا سایہ بھی اٹھ گیا۔ چوتھے برس خبر آئی کہ دشمنوں نے انہیں زہر دے دیا۔

اس وقت مجھے اتنے ہوش کہاں تھے کہ اس مصیبت کو سمجھتا۔ خالہ خالو کو البتہ بہت صدمہ ہوا۔ اس لئے نہیں کہ ان کا ایک عزیز قریب مر گیا بلکہ اس لئے کہ میرے والد جو دس روپے ماہوار مجھ کو بھیجا کرتے تھے وہ بند ہو گئے۔ کیونکہ ہمارے سارے خاندان میں سب سے زیادہ غربت انہی کے ہاں تھی۔ بیچارے سخت پریشان کہ ایک بڑا سہارا گیا۔ لیکن مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ۔ خدا سے لڑا نہیں جاتا۔ صبر شکر کرکے بیٹھ رہے۔ میرے پہلے سے چچا جو چلے اب کہاں

سے ہوتے۔ تعلیم و تربیت میں بھی قدرتی طور پر کمی آگئی۔

اس زمانہ کی دیسی ریاستوں کا دستور تھا کہ اگر کوئی قدیم ملازم مرجاتا تو اسکی جگہ اس کے کسی وارث کو ملتی۔ تھوڑے دن کے بعد وہاں سے اطلاع آئی کہ مولوی صاحب کا کوئی لڑکا ہو تو ریاست اس کو باپ کی جگہ دینے کے لئے تیار ہے مگر میں کس قابل تھا۔ رشتہ داروں میں کسی نے کالے کوسوں جانا پسند نہیں کیا۔ کسی کو اتنی بھی توفیق نہ ہوئی کہ خط و کتابت سے تعلق تو قائم رکھتا۔ جواب تک نہ دیا۔ کم از کم میری میتی اور اپنی ناداری کا ہی خیال رکھتے رہتے تو شاید میرا کچھ گزارا مقرر ہو جاتا یہ بھی نہ ہوتا تو آئندہ کے لیے حقوق تو قائم رہتے۔ پرانے خیال کے لوگ تھے اپنی کُل میں مست اللہ کے سوا کسی کے آگے ہاتھ نہ پسارنے والے غرضکہ کچھ نہ کیا اور والد کی خدمات کا کوئی صلہ نہ ملا

خالو صاحب کا شہر کے اچھے حافظوں میں شمار تھا۔ بچے پڑھاتے تھے۔ میں ہوشیار ہو گیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ مکتب لے جانے لگے اور بغدادی قاعدہ شروع کرا دیا۔ ان دنوں انگریزی تعلیم عام نہ تھی۔ ہوتی بھی تو ہمارا خاندان ٹھیرا ملانے قسم کا۔ کب گوارا ہوتا کہ ان کے بچے کرشانوں کا علم پڑھیں۔ انھوں نے بہت سے بہت یہ کیا اور یہی ان کے نزدیک بڑا علمی کمال تھا کہ مجھے حافظ بنا دیا۔ اب اسے میرا شوق سمجھو کہ اردو فارسی میں بھی کچھ شد بد پیدا کر لی قصے کہانیوں کی کتابیں خاصی روانی کے ساتھ پڑھنے لگا۔ لیکن زمانہ جس چال سے چل رہا تھا اس کا ساتھ میں کس طرح دے سکتا۔ مدتوں میری حالت کنوئیں کے مینڈک کی سی رہی۔ کسی سے کچھ واسطہ نہیں گھر سے نکلا مسجد میں اور مسجد سے گھر میں۔ خالو سیدھے سے مسلمان جنتی آدمی دنیا کی انھیں کیا خبر کہ کس رنگ پر جا رہی ہے اور آنے والی نسلوں کو عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کے

لے کیسی تعلیم دینی چاہیے۔ مسلمانوں کی سی وضع بنا لینا ہی ان کی رائے
میں سب کچھ تھا۔

ایسے ماحول میں ضروری معاشی تعلیم کہاں سے ہوتی۔ خالو جان کو علوم جدید
سے نفرت، انگریزی کا جہاں کسی نے نام لیا اور انھوں نے کفر کا فتویٰ دیا۔ لمبی
داڑھیوں اور گھٹے ہوئے سروں کے عاشق تھے خواہ وہ مردہ شو اور جمعرات کی
روٹیاں کھانے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ جس دن انھوں نے مجھے اپنا خلیفہ بنا کر
دو چار لڑکے میرے سامنے بٹھائے ہیں ان کی خوشی کوئی دیکھتا گویا مجھ کو
اپنی سلطنت بخش دی تھی۔ غرضکہ میں کودن کا کودن رہا۔ لیکن ہوا کے ساتھ
رت بدلا کرتی ہے۔ اگلے طور طریق خود بخود مٹتے جا رہے تھے نئی روشنی
نئی فضا برابر چھائی چلی جاتی تھی۔ محض قرآن خوانی کے مکتب بے رونق ہونے
لگے۔ نرے حافظوں کو روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ خالو جان کا تو ذکر نہیں
آخری دنوں میں کیا کسی بدعت کے مرتکب ہوتے۔ میں البتہ پاس پڑوس کے
لڑکوں کو دیکھ کر للچایا اور سوچا کرتا کہ کیا میری تقدیر میں مکتب پڑھانا لکھا ہے
ایسی کوئی صورت نہیں نکلے گی کہ اس غم دوں سے نجات ملے۔

پندرہ سولہ برس میرے یونہی گزر گئے۔ دماغ تو ٹھٹھرا ہی تھا اگر ولولے
شباب کی پیداوار نہ ہوتا تو ہاتھ پاؤں بھی ٹھٹھر کے رہ جاتے کیونکہ بیچارے
خالو جان کے ہاں مذہب قید خانے کی ایک کوٹھڑی تھی۔ ان کے چاروں طرف
شرک، بدعت اور بے دینی کے جال بچھے ہوئے تھے انھوں نے اپنے خیال
میں اسلام کی جو حدیں بنا رکھی تھیں کسی کا پاؤں ان سے چھوا اور خسرۃ الدنیا والآخرۃ
ہوا۔ خیر۔ بہرحال نہایت نیک آدمی تھے۔ میں بھیگتے بھیگتے میں بالکل اُلو
کا اُلو بنا رہا۔ آئے دل کا بچاؤ تو ایک طرف مجھے واقعی یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عورت

مردوں میں ڈاڑھی اور چوٹی کے علاوہ اور کیا فرق ہے؟ برابر کے لڑکوں سے وہ
ملنے نہ دیے کوئی ایسی ویسی کتاب ہاتھ میں دیکھتے تو چھین لیتے۔ لیکن جب
بہار کے دن آتے ہیں تو بلبل آپ ہی آپ چہکنے لگتی ہے۔ جوانی کے ولولے
نکلنے کا راستہ خود بنا لیتے ہیں۔

شباب آیا اور پورے جوش کے ساتھ۔ مسجد کی روٹیوں میں یہ تاثیر
مخصوص ہے۔ ابتدا میں گلستان کا پانچواں باب پڑھا تھا اس کے سمجھنے
کی چیز کہاں تھی جو سمجھتا۔ اب سمجھا دوبارہ سہ بارہ پڑھتا اور مزے لیتا۔ رفتہ
رفتہ خیال مجسم ہونے لگا۔ رات کو حسن وعشق کے خواب دیکھتا اور صبح سے شام
تک تعبیر کی فکر میں محو رہتا۔ گھر میں کوئی سامان نہ تھا۔ گھر سے باہر نکلنے کی اجازت
نہ تھی ادھر جوانی دیوانی دیواریں کودنے پر آمادہ۔ ہر وقت فساد کے لئے تیار
خدا بھی بڑا کارساز ہے۔ حافظ ہونے کی شرم رکھ لی باہر جاکے مارنے سے
بچا لیا۔ خالو صاحب کی دور دراز کی ایک بہن تھیں۔ تعویذ گنڈوں پر اعتقاد
رکھنے والی۔ آئے دن جھو جھکا کی ضرورت پڑتی رہتی۔ اتفاق سے ان کے
میاں دوسرے خیال کے تھے۔ حرام گنتا سیانوں میں نیاز نذر کا خرچ۔ پھر کوئی
ایسا راز دار بھی نہ تھا کہ بھید نہ کھلنے دیتا۔ اس لئے جب کوئی اونچی نیچی بات
ہو جاتی خالہ سے ملنے کا بہانہ کیا ڈولی میں سوار ہوئیں اور ہمارے ہاں آگئیں
خالو صاحب بھی ان کی خاطر سے کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے اور اللہ کے نام کی
برکت سے ان کا کام بھی ہو جایا کرتا۔

اس مرتبہ جو وہ آئیں تو ایک لڑکی بھی ساتھ تھی۔ لڑکی کیا گلاب کا پھول۔
چمپا کی کلی۔ سارے کنبے کا روپ اسی میں آگیا تھا۔ یگانگت کا ملنا جلنا خالو جان
تو خاندان کے بزرگ ان سے کون چھپتا۔ رہا میں تو مجھ سے بھی کچھ زیادہ نہ

رتھی۔ آنکھ مچولی کا سا پردہ ہو جاتا۔ چھوٹا گھر، بڑا بڑکا معاملہ۔ یکایک جو میں گھر میں آیا تو چاند نکلا ہوا دیکھا۔ پہلے تو لڑکی میرے آتے ہی پیٹھ موڑ چھپاکے سے کوٹھری میں دبک گئی۔ لیکن نظر کام کر چکی تھی۔ دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ ہر وقت اداس رہنے لگا۔ محبت میں جتنا مزہ ہے، اتنی ہی بدمزگی بھی۔ آٹھ پہر اس کی شکل سامنے رہتی کسی کام میں جی نہ لگتا چلتے پھرتے۔ بیٹھتے اٹھتے سوتے جاگتے اسی کا خیال رہتا۔ سورۂ یوسف کے سوا کوئی سورت یاد نہ رہی۔

اللہ میاں کو بھی اس آگ میں پھونس ڈال کر بھڑکانا منظور تھا۔ اب جو وہ آتیں تو لڑکی بھی ساتھ ہوتی۔ میں کہاں ٹلتا بلکہ کسی نہ کسی بہانے تاک جھانک کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ عشق و مشک چھپا نہیں رہتا۔ خالہ میری نگاہیں تاڑ گئیں ان کے پہلے ہی سے لڑکی پر نظر تھی۔ ادھر تو مجھ سے کہا "بیٹا۔ کوئی گھر میں آئے تو اس طرح نہیں جم جایا کرتے خدا جانے کسی کو کیا بات کھل جائے۔ باہر چلے جایا کرو۔" اور ادھر باتوں باتوں میں نسبت کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ میں بھی برابر سن گن لیتا رہتا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ خالو جان نے باقاعدہ پیام بھی بھیج دیا تو میری خوشی کا کیا پوچھنا۔ باچھیں کھل گئیں۔ ایک ایک گھڑی جواب کے انتظار میں گن گن کر گزارنے لگا۔ لیکن تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ۔ سہرے کے پھولوں کی کیاریوں کو ابھی آنسوؤں سے سینچنا تھا۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کس طرح ہو جاتا۔ ہماری غربت اور میری ملاں وضع نے پھانس ماری۔ کورا جواب آ گیا۔ بھلا ایک کھاتے پیتے گھر کی بیٹی مجھ جیسے قل اعوذیے کو کون دینے پر راضی ہوتا۔ خالی شرافت کو لے کر کیا چاٹتے؟ جس کا باپ ڈیڑھ سو روپے کا نوکر ہو وہ اپنے داماد کو مسجد میں سارے دن بچوں کے ساتھ مغز مارتے دیکھتے

خالو جان اور خالہ جان تو خیر اپنا سامنہ لے کر چپ ہو گئیں مگر میں کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ کپڑے پھاڑ کر کہیں نکل جاؤں یا کچھ کھا کر سو رہوں۔ آہ! یہ آگ نہ اپنے لگائے لگتی ہے نہ اپنے بجھائے بجھتی ہے۔ کلیجے میں شعلے سے بھڑکتے اور میں سوختہ ہوا چلا جاتا۔ میرے پاس زر تھا نہ زور۔ صرف ایک زاری تھی وہ بھی دوسروں کا دل پگھلانے کے لئے نہیں۔ کیونکہ میں روتا بھی تو چھپ کر کہ کوئی دیکھ نہ لے انداز جنون بے شرم نہیں ہوئے تھے۔

جب کوئی تدبیر بن نہ پڑی اور دل کسی طرح سنبھلتا نہ معلوم ہوا تو ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ آؤ خالو جان کے تعویذ گنڈوں کی کتاب تو دیکھیں شاید کوئی عمل ایسا نکل آئے کہ لڑکی والوں کی ناک ٹوٹ جائے۔ راہ نجات نہ پائی تو خدا یاد آیا۔ ہارے ہوئے کی آخری منزل تو یہی ہوتی ہے اس کام میں کوڑی پیسے کی ضرورت نہیں صرف یکسوئی استقلال اور محنت چاہیئے۔ تو محبت میں ان چیزوں کی کیا کمی پھر جب محبت بھی حرام کاری کے لئے نہیں نکاح کی غرض سے ہو۔ چنانچہ تسخیر و حُب کے جتنے عمل مجھ کو ملے ایک ایک کر کے سب ہی کو میں نے نہایت پابندی کے ساتھ پڑھ ڈالا۔ خدا کا وعدہ جھوٹا نہیں جو مانگتا ہے پاتا ہے۔ البتہ مانگنے کی طرح مانگے یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ عملوں نے تاثیر دکھائی یا خدا کو ویسے ہی میرے گڑگڑانے پر رحم آگیا۔ بہرحال میری دعا قبول ہوئی کچھ سامان ایسے ہوئے کہ بیٹی والے خود بخود ڈھلے اور ایسے کہ گویا ادھار کھا لیا تھا۔ بات پکی کرنے کو خالو جان نے جنم سے لے کر اب تک کی ساری کہانی سنا دی۔ یہ بھی کہہ دیا کہ لڑکا خالی گول کا ڈھول ہے۔ مسجد میں لونڈے پڑھانے کے سوا اسے کچھ نہیں آتا۔ تمھاری لڑکی

کو لالی بنانا پڑے گا۔ مگر وہ کچھ ایسے بجٹی ہوئے کہ آخر ہاں کرتے ہی مولوی نے عرش پر نکاح پڑھوا دیا تھا۔ دلہن بغیر دولہا کے گھر آئے کب رہ سکتی تھی۔ آٹھ دن کے اندر اندر برات بھی چڑھی اور دلہن بھی گھر میں آ گئی۔

میری زندگی سہارے کی زندگی تھی۔ کھانے پینے پہننے اوڑھنے سب میں دوسروں کا دست نگر۔ خشتم پشتم گزارہ کر رہا تھا۔ شادی کے بعد مجھے اپنے فرائض کا احساس ہوا۔ ایک سے دو ہو گئے تھے۔ خالو جان کی وفات معلوم تھی۔ دلہن کے چاؤ چوچلے کہاں سے اٹھاتے؟ اب میری جان کو یہ دوسری الجھن لگی۔ اصل تو یہ ہے کہ محبت میں اول سے آخر تک آفتیں ہی آفتیں ہیں۔ دنیا میں عجب گورکھ دھندا ہے۔ کبھی سلجھتا ہی نہیں۔ ایک ارمان نکلا کہ چاند اور موجود خدا کی تو ہو گئی تھی لیکن خانہ آبادی کا سامان نہ تھا۔ یہی سال دو سال کھانے پہننے کے ہوتے ہیں اور کچھ نہ سہی تو دو پیسے کے پھول چار پیسے کا عطر، تیل مسی کاجل تو ہو۔ آدمی ہے کبھی چٹ پٹے میٹھے کو بھی جی چاہتا ہے۔ غریبی سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ کورے بامن جنیو اوڑھنا جنیو بچھانا۔ خالی چاہت سے تو نہ تن ڈھکتا ہے نہ پیٹ بھرتا ہے۔

رات دن فکر کرنا اور فکر میں گھلا جاتا۔ کسی قسم کی لیاقت ہوتی، کوئی ہنر جانتا تو کسی سے کہنا سننا بھی اچھا معلوم ہوتا۔ حافظوں کی جیسی اس زمانے میں قدر ہے سب جانتے ہیں۔ اسی پریشانی میں کئی ہفتے گزر گئے۔ کوئی صورت نہ نکلی کہ اپنی کمائی کا پان چھالیہ بھی گھر میں لاؤں۔ آخر ارادہ ہوا کہ کہیں باہر چلوں۔ دیس چوری پردیس بھیک سنا تھا کہ ؎

عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا!
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

شاید خدا کوئی سامان کر دے۔ چھوٹی موٹی نوکری مل جائے۔ ہچکچاہٹ تھی تو یہ کہ بیوی سے کیا کہوں؟ اور خالو جان کو کیا بتاؤں! بے سر و پا اونٹ کی طرح منھ اٹھا کر نکل جانا کیا معنی رکھتا تھا؟ صدقے اس مسبب الاسباب کے یہاں بھی اس نے میری سنی والد مرحوم کے ایک دوست حاجی نعمت تھے کتب فروش مکتب کے لڑکوں کے لئے سیپارے خریدنے جو گیا انھوں نے حال پوچھ میں نے اپنی ساری داستان سنا دی اور باہر جانے کا ارادہ بھی ظاہر کیا پرانی وضع کے ملنے والے تھوڑی دیر تو کچھ سوچتے رہے پھر بولے "میاں اگر دلی سے باہر ہی جانا چاہتے ہو اور تمہارا رزق خدا نے پردیس ہی میں آتارا ہے تو آگرہ چلے جاؤ۔ شیخ انوار الحق کا نام پوچھ لینا۔ ان کا چھاپہ خانہ ہے مشہور آدمی ہیں۔ میں خط لکھے دیتا ہوں وہ تمہیں مزدا پے ہاں نوکر رکھ لیں گے۔ آگرہ سب کا جانا بوجھا۔ زیادہ دور بھی نہیں۔ پھر شیخ جی کے چھاپہ خانہ سے دنیا واقف ہے۔ اس پر طرہ حاجی نعمت صاحب کی سفارش۔ خالہ خالو دونوں نے کوئی وہم نہیں کیا۔ بیوی کو البتہ رنج تھا۔ مگر میری اور اپنی آئندہ خوشی کے لئے اسے بھی کوئی عذر نہ ہوا۔ سامان کیا؟ دو جوڑے ایک مختصر سا بستر لے گلے میں قرآن شریف لٹکا ریل پر سوار ہو آگرہ پہنچا۔ واقعی شیخ صاحب سچ مچ کے مسلمان تھے۔ حاجی جی کا خط پڑھ کر بڑے متاثر ہوئے۔ اللہ اللہ کیا دنیا تھیں۔ آج وہ لوگ کہاں! اسی دن سے میرا دس روپے مہینہ کر دیا اور میں ان کے بچوں کو کلام مجید اور اردو فارسی پڑھانے لگا۔

نوکر تو ہو گیا اور عزت کے ساتھ لیکن گھر سے بے گھر۔ بیوی سے جدا قسمت کی خوبی کہ شادی ہوئی تو دیس نکالا ملا۔ دس روپلی میں الگ مکان لیکر بیوی کو تو بلانے سے رہا۔ اللہ شیخ صاحب کی قبر کو نور سے بھرے مجھے کہنے

دیکھ کر مجھ سے پوچھا کہ میاں میں تمہیں کچھ پریشان سا دیکھتا ہوں" میرا دل بھر آیا۔ آنسو نکل پڑے اور جو تکلیف تھی ان سے بیان کر دی۔ اس کے بعد وہ مجھ کو اپنے ہاں جو کتابیں چھپتیں ان کے پروف صحت کے لئے دینے لگے میری زندگی پانچ سات روپے اور بڑھ گئی پھر انھوں نے یہ کیا کہ جب کاروبار کے سلسلہ میں کسی کو دلی بھیجنا ہوتا۔ مجھ کو بھیجتے اس طرح ادھر تو میری ایمانداری جز رسی اور حسن خدمت ان کے دل میں گھر کرتی رہی اور ادھر تقریباً ہر مہینہ مجھے بیوی سے ملنے اور اس کی دلدہی کا موقع مل جاتا۔ غرضیکہ میں اب خوش تھا۔ مختلف قسم کی کتابوں کے پروف دیکھتے دیکھتے میری قابلیت بھی بڑھتی جاتی تھی۔ شیخ صاحب بھی مجھے اپنے لئے بکار آمد سمجھنے لگے تھے۔ احول کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اب مجھے شوق ہوا کہ کچھ انگریزی اور حساب بھی سیکھنا چاہیے کیونکہ چھاپہ خانے میں انگریزی پڑھے لکھوں کی زیادہ قدر تھی اور شیخ صاحب بھی دو چار مرتبہ کہہ چکے تھے کہ "میاں سلیم اگر تم انگریزی لکھنا پڑھنا جانتے ہوتے کھاتے کو سمجھتے تو میں تمہیں اپنے ہاں منیجر کر دیتا"

میرے پاس وقت تھا اور محنت کے لئے مضبوط قویٰ۔ میں نے دفتر کے ایک بابو سے انگریزی پڑھنی شروع کر دی اور ساتھ ہی ساتھ جب فرصت ملتی چھاپہ خانے کے محاسب کے پاس جا بیٹھتا۔ خدمت سے غفلت نہ کی۔ سال ہی بھر میں خدا نے ایسا کیا کہ میں معمولی چھٹی چپاٹی لکھنے پڑھنے لگا اور حساب کتاب میں بھی ایسی مہارت پیدا کر لی کہ منیم جی پاؤں پھیلائے سویا کرتے اور ان کا سارا کام میں کیا کرتا۔ اب میری تنخواہ بھی تیس روپے ہو گئی تھی اور یہ بھی سنا تھا کہ شیخ صاحب مجھے اپنا داہنا ہاتھ بنانے والے ہیں لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ گھر کے سب ساتھی ہیں جنم کا کوئی نہیں۔ گھر میں بال بچے

پیدا ہونے کے دن آئے۔ میں نے خالو جان کو لکھ دیا کہ "نویں مہینہ لگتے ہی مجھے اطلاع دے دیجئے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ دوں۔ جاپے کا سارا انتظام خود کروں گا۔ اس مطلب کے لئے میں نے شیخ صاحب سے کچھ رقم پیشگی لینے کا سوال بھی ڈال دیا تھا اور انھوں نے ہاں بھی کر لی تھی۔

آدمی اپنے لئے سب کچھ چاہتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ میاں چاہیں۔ میاں کی مرضی نہیں ہوتی تو ساری کوریگر یاں دھری رہ جاتی ہیں۔ قدرت کو تو عین کربال میں خار پھینکنا منظور تھا۔ محبت کا پھول کیا کھلتا، شاخ ہی پر بجلی گر تی تھی۔ ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ "دلہن کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے لیکن ساتھ ہی ایک ایسا زلزلہ آیا کہ زمین پھٹ گئی اور زچہ بچہ دونوں اس میں سما گئے۔" مذہبی خیالات والوں میں خواب بڑی اہمیت رکھتے ہیں ڈر کر جو آنکھ کھلی پھر نہ لگی۔ طرح طرح کے وہم آتے رہے۔ صبح کی نماز پڑھتے ہی چھاپہ خانہ جا پہنچا کہ شاید کام میں جی بہل جائے۔ شیخ صاحب کی عادت تھی کہ مسجد سے نکل کر سیدھے دفتر میں آ بیٹھتے یا صحن میں ٹہلا کرتے۔ مجھے جو خلاف معمول اتنے سویرے آتے دیکھا ساتھ پریشان بھی پایا تو پوچھا "کہو بھئی! خیریت؟ آج اتنی جلدی آ گئے؟ گھر سے بال بچہ ہونے کی خبر تو ابھی نہیں آئی؟" میں خواب کی باتوں کو ان سے کیا کہتا۔ ہاں ناں کر کے ٹال دیا اور اپنے کام کرنے کی جگہ جا بیٹھا جی کیا لگتا۔ دماغ پر توہمات سوار تھے۔ کبھی یہ کاغذ اٹھاتا کبھی وہ کتاب ٹٹولتا اتنے میں گھنٹے نے گیارہ بجائے۔ دلی کی طرف سے ڈاک ایسے ہی وقت آیا کرتی تھی۔ گھبرا کر اٹھا کہ ڈاکیہ آتا ہی ہوگا۔ انتظار کرتے کرتے وحشت میں دروازہ کے باہر جا کھڑا ہوا۔ کھڑا ہوا ہی تھا کہ تار والا آتا دکھائی دیا۔ تار والے ایک دو روز چھاپہ خانہ میں آیا کرتے۔ کوئی نئی بات نہ تھی مگر میرا کلیجہ دھک

دھک کرنے لگا۔ اس نے آتے ہی میرا نام لے کر پوچھا کہ "حافظ سلیم چھاپہ خانہ میں کون ہیں ان کا تار ہے" میں نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ "سلیم میرا نام ہے اندر آؤ" لیکن ہاتھ پاؤں قابو میں نہ رہے۔ بڑی مشکل سے اندر آیا۔ تار کی رسید دی اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے لفافہ کھولا۔ اب جو پڑھتا ہوں تو بیوی کے وضع حمل کے بعد مرنے کی خبر۔ زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔ بہت سنبھلا، نہ سنبھل سکا دھڑ سے گر پڑا۔ کہتے ہیں کہ شیخ صاحب نے انسانیت اور ہمدردی کا حق ادا کر دیا۔ کئی کئی حکیم، ڈاکٹر بلائے، جب تک مجھے ہوش نہ آگیا برابر میرے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوسرے دن صبح کو میں نے آنکھ کھولی تو کیا دیکھتا ہوں شیخ صاحب کرسی پر موجود ہیں اور میں ان کے بستر پر۔ بابو کے ہاتھ میں تار۔ گویا اب تک انھیں یہ خبر نہ تھی کہ حادثہ کیا ہوا تار کا مضمون سن کر انھوں نے گردن ہلائی انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھی بزرگانہ انداز سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے "عزیزمن! اللہ کو یاد کرو مشیت ایزدی میں انسان کا کیا دخل۔ ہم تو امانت دار ہیں۔ اس کی چیز تھی اس نے لے لی۔ مسلمان ہو اور خدا کے فضل سے حافظ۔ صبر و شکر کا ثواب بہت بڑا ہے"!

یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔ میرا دل بھرا چلا آتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی کے گلے سے لگ کر خوب روؤں۔ ہاتھ پھیلائے۔ شیخ صاحب اولاد والے تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کی طرح مجھے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔ آپ بھی روئے اور میرا جی بھی ہلکا ہونے دیا۔ دو چار منٹ کے بعد بولے "کہو اب کیا ارادہ ہے؟ گھر جانا چاہو تو انتظام کردوں" میں نے کہا "قبلہ! گھر تو اجڑ گیا کیا صورت لے کر جاؤں اور کس کو دکھاؤں۔ دیکھنے والی ہی نہیں رہی میرا ٹھکانہ آپ کے قدموں کے سوا کہاں ہے۔ ہاں ایک دفعہ دلی سے ہمیشہ

کے لئے رخصت ہونے جاؤں گا۔ اپنی مردہ حسرتوں کو خاک میں ملا ذرا بھی دیکھ لوں۔"

شیخ صاحبؒ نے میری خواہش معلوم کر کے اور کچھ کہنا فضول سمجھا فوراً میرا بستر بندھوایا۔ ایک آدمی میرے ساتھ کیا کہ بحفاظت مجھے گھر پہنچا دے۔ گاڑی میں سوار کرانے کو آپ باہر تک آئے۔ چلتے وقت سو روپے دیئے اور کہا برخوردار! خرچ سے تنگ نہ ہونا۔ ضرورت ہو اور منگا لینا یہ تمہارا گھر ہے۔ کوئی جلدی نہیں۔ دس دن میں پندرہ دن میں جب تمہاری طبیعت درست ہو جائے آجانا۔

گھر آیا۔ دیوانوں کی سی حالت۔ ایک ایک کا منہ دیکھتا اور روتا۔ لوگ سمجھاتے مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ جگی چوٹ تھی۔ اندر ہی اندر ہوک اٹھتی اور تلملا اٹھتا۔ قبر پر پہنچا۔ اس مٹی کے ڈھیر پر گر پڑا۔ لیٹ گیا۔ نہ جانے کیا کیا بکواس کرتا رہا آنسو کہاں تک بہتے۔ تڑپتے تڑپتے نڈھال ہو گیا تھا۔ آخر صبر سا آچلا۔ قبرستان پر نظر ڈالی۔ ہزاروں مائی کے لال اسی طرح پڑے سوتے تھے۔ فاتحہ پڑھی۔ دل ذرا اور ٹھہرا۔ رات ہو چلی تھی گھر آ گیا۔ کدھر جاتا۔ کیا کرتا؟ لیکن یہاں در و دیوار روتے ہوئے دکھائی دئے۔ ان کی ہر چیز دیکھتا اور کپڑے پھاڑنے لگتا۔ تھوڑی دیر تک تو کلیجہ پکڑے منہ اوندھائے پڑا رہا۔ جب زیادہ بے چین ہوا تو مسجد میں جا بیٹھا اور صبح تک قرآن شریف پڑھا کیا۔ نماز سے فارغ ہو کر پھر قبرستان کی راہ لی۔ اب میرا یہ معمول ہو گیا کہ علی الصبح ان کی قبر پر جا بیٹھتا مغرب کے وقت تک برابر قرآن پڑھتا رہتا اور چراغ جلے واپس آتا۔

اللہ کے کلام کی برکت اور میرا اخلاص ان کی روح کو وہ آزادی نصیب ہوئی کہ چوتھے پانچویں دن ہی کے بعد سے وہ میرے خواب میں آنے لگیں،

میرے اپنے اضطراب میں بھی بہت سکون ہو گیا تھا۔ جب رات کو ان کا خیال کر کے لیٹتا۔ آنکھ بند ہوتے ہی انھیں اپنے پاس دیکھتا۔ روز نئے لباس میں آتیں۔ قسم قسم کی باتیں کرتیں۔ دو دن یہ سلسلہ جاری رہا اور میں سمجھنے لگا کہ اللہ میاں نے دنیا کی آنکھوں سے اوجھل اب ہماری روحوں کی شادی کر دی ہے اور مادی خوشیوں میں میرا حصہ نہیں رہا۔ اس لئے دنیا سے بیزار ہو جانا قدرتی تھا نوکری اور نوکری کا خیال تو ایک طرف جینے کی آرزو بھی نہیں رہی تھی جینے کی تمنا ہوتی بھی تو کس کے لئے؟ عالم ارواح میں شادمانی اور کامرانی ان اسباب پر منحصر نہیں۔ وہاں تو صرف رب العزت کی مہربانی چاہیئے۔ جی تو ہر لمحہ یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح عناصر کی زنجیریں کٹ جائیں، قید ہستی سے نجات ملے اور دن رات ہماری روحیں ایک دوسری سے ہم آغوش رہیں۔ لیکن بے موت مرا نہیں جاتا۔ مرنے کے بظاہر آثار نہ تھے۔ خودکشی اول تو حرام، حرام موت مر کر روحانی مسرت کی توقع عقل و مذہب کے بالکل خلاف۔ دوسرے اجل کیا میرے تابع تھی کہ میں بلاتا اور وہ ہو جاتی۔ بیسیوں کو زہر کھا کر جیتے دیکھا ہے۔ الٹے اور عذاب میں مبتلا ہو گئے وہاں تو اس امانت میں خیانت کی جو سزا ملے گی ملے گی یہیں وہ گت بنی ہے کہ توبہ توبہ!

اسی طرح شاید باید زیستن ناشاید باید زیستن" صبح سے شام اور شام سے صبح ہوتی چلی جاتی تھی۔ ایک دن خدا جانے کیوں؟ میرے دل میں آیا کہ ان سے کچھ وہاں کا حال تو پوچھنا چاہیئے۔ کہتے ہیں آزاد روحوں کو اگلا پچھلا بہت سا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ میں نے تین باتیں سوچیں اپنے مطلب کی اول یہ کہ میں کب مروں گا؟ دوسرے اس عالم میں ہم ایک جا رہ سکتے ہیں یا نہیں؟ تیسرے مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اور یہ بھول گیا کہ ایسے سوالات ممنوع ہیں ان بھیدوں

کو کس مجال ہے جو کھودے۔ دنیا کے کارخانہ میں گڑبڑ مچ جائے آنا بھی نہ سوچا کہ وہ اللہ میاں کے کسی چاہیتے کی روح تو ہے نہیں کہ اس کی زبان کوئی نہ پکڑ سکے۔ افشائے راز میں اگر دھرلی گئی تو قیامت تک چھٹکارا مشکل ہے۔

ہونے والی بات۔ یہ خیالی راحت بھی تقدیر میں نہ تھی۔ عقل پر پردے پڑ گئے۔ دو تین روز تو کچھ ہوا نہ پڑا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی نظر آئیں۔ لیکن میرا پیٹ منہ کو آرہا تھا چوتھی رات یہ ٹھان کر سویا کہ کچھ بھی ہو آج بے پوچھے نہیں رہوں گا چنانچہ انہیں دیکھتے ہی میں نے پہلا سوال کرنا چاہا۔ اس مرتبہ خلاف معمول وہ میرے پاس بیٹھی نہیں الگ کھڑی رہیں۔

میں :۔ کیوں کھڑی کیوں ہو؟

وہ :۔ (روکھے منہ سے) یوں ہی!

میں :۔ دو تین روز سے میں تمہیں کچھ مکدر بھی دیکھ رہا ہوں۔

وہ :۔ تمہاری بلا سے!

میں :۔ یہ کیا کہا؟

وہ :۔ کچھ نہیں (ٹھنڈا سانس لے کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم زیادہ روز تک نہیں مل سکتے۔

میں :۔ ایسا غضب نہ کرنا پھر میں کیا کروں گا؟

وہ :۔ مرضی الہٰی۔

میں :۔ کوئی تدبیر؟

وہ :۔ میں کیا بتاؤں؟

میں :۔ تم نے تو شادی کے بعد سے اب تک کبھی مجھ سے بے وفائی کی نہیں۔

وہ :۔ مگر تم تو مجھے بے وفا بنا رہے ہو۔

میں:۔ آج کی تمہاری باتیں تو کچھ عجیب ہیں ؟
وہ:۔ ہوں گی اچھا چلو دوسری باتیں کرو۔
اس کی روح لوح محفوظ کو پڑھ آئی تھی۔ اس نے اپنی صورت اپنے اشارات سے مجھے بہتیرا آگاہ کرنا چاہا۔ لیکن میں مطلق نہ سمجھا بلکہ تسکین کی شکل نظر آئی تو صرف اپنے سوالات کے جوابات میں کچھ ویران کی طرف مایوسانہ دیکھنے کے بعد بولا۔
میں:۔ پرسوں اترسوں سے میں تو کئی سوال دل میں لئے بیٹھا تھا۔ تم نے تو سب پر پانی پھیر دیا۔
وہ:۔ بے چین ہو کر، کیسے سوال ؟
میں:۔ ہیں! پوچھوں؟ بتاؤ گی ؟
وہ:۔ (کانپتے ہوئے) نہ پوچھو!
میں:۔ ڈر کیوں گئیں ؟ چھوٹے چھوٹے تین سوال ہیں۔ بارے اپنے متعلق۔
وہ:۔ (ایک گہرا سانس لیتے ہوئے) تم جانو۔
میں:۔ تم نے کہا ہے کہ اب ہم زیادہ نہیں مل سکیں گے۔ جسمانی جدائی تو تھی ہی رات کی دیدار بازی سے کچھ سہارا ہو گیا تھا یہ بھی جاتا رہا تو زندگی اجیرن ہو جائے گی خدا کے لئے اتنا بتا دو کہ میں مروں گا کب ؟
میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ ایسی ملتجی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی منت کر رہا ہو کہ ایسے سوالات نہ کرو۔
میں:۔ (اپنی دھن میں) معلوم ہے تو بتا دو۔ چپ کیوں ہو گئیں۔
وہ:۔ ابھی سے مرنے کی کیا فکر۔ ابھی تو ایک شادی اور کرنی ہے۔ بچوں کی بہاریں دیکھنی ہیں۔
میں:۔ کبھی نہیں ہو گا۔ اگر میری عمر لمبی کھنچی تو میں آپ مر جاؤں گا۔

وہ :۔ نہ جینا انسان کے اختیار میں ہے نہ مرنا۔ ہوش میں آکر باتیں کرو۔

میں :۔ اچھا یہ کہو اس عالم سے گزر کر اس عالم میں ہم ایک دوسرے سے بے تکلف مل جل کر رہ سکیں گے یا نہیں ؟

وہ :۔ خدا نے چاہا تو ضرور۔ بشرطیکہ تم یہاں اس کی مقررہ حدود کے اندر رہے اس کی مرضی پر چلے اور اپنے خیالات کو صحیح رکھا۔

میں :۔ اس کے کیا معنی ؟

وہ :۔ (تیوری چڑھا کر) تم تو آج سے پہلے ایسے کٹ حجتی نہ تھے۔ لو میں جاتی ہوں

میں :۔ ذرا ٹھہرو۔ ایک سوال اور رہ گیا ہے اس کا بھی جواب دیتی جاؤ۔

وہ :۔ (سہم کر) افسوس لکھا یہاں بھی پورا ہوتا ہے اور وہاں بھی۔ تمہاری محبت سے مجبور ہوں خیر پوچھو ؟

میں :۔ یہ اور بتا دو کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے ؟

وہ :۔ (دانتوں میں انگلی دبا کر) خبردار! نہ میں کہہ سکتی ہوں نہ تم سن سکتے ہو۔ میں جانتی تھی کہ تم اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارو گے۔ بس اب میرا ایک منٹ بھی ٹھہرنا ممکن نہیں۔ اللہ حافظ !

یہ کہہ کر وہ جو غائب ہوئیں تو وہ دن اور آج کا دن پھر خواب تو خواب تصور میں بھی ان کی صورت نظر نہ آئی۔ ہزاروں دعائیں مانگیں چلتے پھرتے کھینچے مگر در قبول نہ کھلا کہ کبھی جھلک تو دیکھ لیتا۔

جسمانی جدائی کے بعد روحانی مفارقت کا یہ دوسرا صدمہ پڑا۔ مجھے اپنی حماقت پر بڑا غصہ آیا بار بار اپنے اوپر ملامت کرتا اور سر دھنتا لیکن تیر از کمان رفتہ باز نمی آید۔ اپنی ڈاڑھی نوچتا۔ بوٹیاں کاٹتا اور رہ جاتا۔ کس کا کھانا کس کا پینا کیسی نماز کیسا روزہ ؟ دحشیوں کی طرح چاروں طرف ڈھونڈتا پھرنے لگا۔ خالہ اماں روئیں خالو

جان پڑھ پڑھ کر دم کرتے۔ کیا چوتا تھا۔ اتنے میں رمضان کا مہینہ آ گیا۔ کئی سال سے خالو جان حج بیت اللہ کا ارادہ کر رہے تھے اتنی رقم نہیں جڑی تھی کہ اس فرض کو ادا کریں۔ اتفاق سے امسال خدا نے مدد کی۔ خالو اور خالہ حج کے لئے تیار ہوئے مجھے کس پر چھوڑتے۔ دوستوں سے مشورہ کیا۔ دیوانے پر کون ہاتھ رکھتا۔ صلاح ہوئی کہ جس طرح ہو سکے مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ مقدس سفر ہے۔ سمندر کی آب و ہوا شاید دماغ پر اچھا اثر کرے۔ پھر مسلمانوں کے عقیدے کے موافق وہاں دعائیں مقبول ہوتی ہیں۔ کعبہ کا غلاف پکڑ کر سبز گنبد والے کے روضہ پر اللہ سے التجا کریں گے کہ اس یتیم کی لاج آپ کے ہاتھ ہے ضرور اس کی دین و دنیا دونوں سنور جائیں گی۔ داتا کے در سے کوئی محروم نہیں آتا۔

خالو جان نے اپنا ارادہ مجھ پر ظاہر کیا۔ خدا کی قدرت کہ میرے دل کا ورق اس وقت سیدھا تھا عقل کی باتیں کیں کہ اس سے بڑھ کر مبارک صلاح کیا ہو سکتی ہے۔ مگر آپ میرا بار کیونکر اٹھا سکتے ہیں۔ دیکھئے میں فکر کرتا ہوں اگر بندوبست ہو گیا تو ضرور چلوں گا۔ خالو جان میری یہ باتیں واہی تباہی سمجھے۔ دیوانے آدمی کسی کسی وقت انسانیت کی جون میں بھی آ جاتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ میرا کوئی کاروبار نہیں۔ اندوختہ نہیں۔ نوکری بھی چھوڑ چکا ہوں۔ حج کا خرچ کہاں سے لاؤں گا یہ بھی وحشت کی ایک اپج ہو گی جو کہہ رہا ہے کہ "دیکھئے فکر کرتا ہوں" انھیں اندیشہ تھا کہ وقت پر کہیں مچل نہ جاؤں اور کوشش اکارت جائے تاہم اُنھوں نے چڑھاوے کے دو چار زیور بیچ کر سو پچاس کا انتظام کیا۔ ادھر مجھے کچھ ایسی لو لگی کہ دوسرے سارے خیالات رفوچکر ہو گئے ہر وقت حج کی دھن اور اخراجات سفر کے حاصل کرنے کی فکر۔ ملا کی دوڑ مسجد۔ لے دے کے مجھے شیخ صاحب یاد آتے تھے پہلے تو ہمت نہ پڑی کہ دہلی آ کر انھیں کبھی خط نہیں لکھا۔

اب کس منہ سے ان سے کچھ مانگو۔ پھر خیال آیا کہ ثواب میں دوسروں کو شریک کرنا بھی ثواب ہے خط تو بھیجو۔ آخر انھیں آگرے سے آنے کے بعد سے ساری کیفیت لکھی اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ آٹھ دن نہیں گزرے تھے کہ وہاں سے خط اور ساتھ سو روپے کا منی آرڈر آیا۔ معلوم ہوا کہ شیخ صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی بیگم صاحبہ کو جب میرا خط سنایا گیا تو انھوں نے یہ عنایت کی تھی۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے ان دنوں حج پر جانے والوں پر نہ آج کی جیسی پابندیاں تھیں نہ اتنے اخراجات سو دو سو میں آدمی خاصہ حاجی بن کر گھر آجاتا تھا۔ میں نے آگرے سے آئی ہوئی رقم خالو ابا کو دی وہ خوش بھی ہوئے اور حیران بھی۔ خوش اس لیے کہ خرچ میں مدد ملی۔ بہت مشکلیں آسان ہو گئیں اور حیران یوں کہ دیوانہ کے پاس یہ رقم کہاں سے آئی۔ زیادہ کرید نہ اس زمانے کا دستور تھا نہ خالو جان کی یہ عادت نہ خود بدمعاش، فریبی تھے جو کسی پر ایسی بدگمانی کرتے۔ الغرض ہمارا مختصر سا قافلہ ریل میں بیٹھ کر بمبئی اور بمبئی سے جہاز میں سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گیا اللہ نے حج بھی کرا دیا اور اپنے حبیب کی زیارت سے بھی مشرف کیا۔ وحشت تو میری جہاز میں سوار ہوتے ہی جاتی رہی تھی خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہی رہے سہے بھی توہمات دور ہو گئے، روحانی اور جسمانی آلائشیں تقریباً ساری کی ساری دور ہو گئی تھیں اور ہم واپسی کے لیے تیار تھے کہ یکایک خالو جان بیمار ہو گئے ضعیفی بھی۔ عمر کا جہاز موت کے کنارے آ لگا تھا۔ ارض مقدس میں قدم رکھتے ہی وہ دعا مانگا کرتے کہ "الٰہی! مرنا تو برحق ہے۔ ایک نہ ایک دن موت آنی ہے کیا اچھا ہو جو یہیں دم نکل جائے۔ تیری رحمت سے کچھ دور نہیں۔ یہ مراد بھی اپنے پیاروں کے صدقے میں پوری کر دے" ہے

دل سے مانگو تو کیا نہیں ملتا — وہ بڑا مہربان داتا ہے

خدا نے ان کی سن لی۔ انتقال ہوگیا۔ خالہ جان کا ساٹھ برس کا ساتھ چھوٹا۔ جزع فزع کرنا تو ان کی شان کے خلاف تھا۔ چپ ہو کر رہ گئیں۔ اللہ والی عورت، کوئی یار نہ مددگار۔ آس نہ اولاد۔ بڑھاپے کا صدمہ۔ صدمہ بھی کاری چپکے چپکے دعائیں مانگتیں، اللہ میاں! میرا بھی پردہ ڈھانک لے۔ جیتے جی آن بان جس کے دامن میں چھپی رہی۔ آخری وقت اس سے دور نہ پھینک۔ ان کو اپنے در پر سلایا ہے تو مجھے بھی پڑ رہنے کی جگہ عنایت کر۔ چوتھے دن رات تو بھی اچھی سوئیں۔ صبح کی نماز خاصی طرح پڑھی۔ تسبیح ہاتھ میں تھی اچھی اچھی مسکرائیں اور جانماز ہی پر لیٹ گئیں۔ میں دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں پھیلا دیے۔ مجھے کچھ شک سا ہوگیا۔ پاس آیا۔ ڈرتے ڈرتے نبض دیکھی۔ وہاں کیا دھرا تھا۔

مذہب میں جب کسی کو زیادہ انہماک ہو جاتا ہے تو موت کے واقعات کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔ مجھے اپنی تنہائی کی فکر کے سوا کوئی اور صدمہ نہیں ہوا۔ تجہیز و تکفین کے بعد اب میں نے چلنے کی ٹھہرائی۔ متوکل لوگوں کا ساز و سامان ہی کیا دو چار مختصر سی گٹھریاں تھیں۔ ان کے منگوانے میں گھنٹوں کی دیر بھی کیسی؟ ٹٹول صرف یہ تھی کہ نقد کہاں رکھا ہے۔ کیونکہ میں تو کورا تھا یہ خبر نہیں کہ روپیہ پیسہ وہ کس جگہ رکھتے تھے۔ خالو جان کی جیبوں اور خالہ اماں کے بٹوے میں دو چار روپیوں کے سوا کچھ نکلا نہیں۔ گھبرا گھبرا کر ایک ایک پوٹلی کو دیکھتا آخر ایک ڈبیا میں سے کچھ اشرفیاں ملیں۔ لیکن مالیت صرف اتنی کہ میں اکیلا دلی پہنچ جاؤں۔ حیران ہوگیا واہ ری اللہ کے بھید اللہ ہی جانے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ ان کی ناداری و مفلسی کا کس شان سے پردہ رکھا ہے۔ اگر وہ دونوں مر نہ جاتے تو کیا حال ہوتا۔ بھیک مانگتے؟ جو ہاتھ

خدا کے سوا کسی کے آگے کبھی نہ پھیلا تھا۔ خدا کے گھر میں پھیلانا پڑتا۔

خدا کی قدرت کا تماشا دیکھتا رہا۔ الغرض تین مہینے کے بعد میں دلی آیا اور حاجی کہلانے لگا۔ حافظ تو تھا ہی حاجی بھی ہو گیا۔ خالو جان کے دوست آشنا عزیز واقارب شاگرد اور معتقد میرے سر کہ ان کی مسجد سنبھالوں لیکن اب میں دوسری ہوا میں تھا۔ مرحومہ کی روح نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ یاد آنے لگی۔ آگرہ کی ملازمت کے مزے عود کر آئے ستے ہونے والی بات ارادوں میں استحکام پیدا کر دیتی ہے اور اسی کے مطابق اسباب بننے لگتے ہیں۔ آگرہ میں شیخ صاحب کے یہاں کسی اسلامی ریاست کے ایک کارندے آیا کرتے تھے۔ انھیں میرے ساتھ کچھ ایسا انس ہو گیا تھا کہ جب آتے چھاپہ خانے کے علاوہ ایک دو بار مجھ سے ضرور ملتے۔ اکثر کہا کرتے میاں شخصی ملازمت کا کیا اعتبار آج ہے کل نہیں انگریزی نوکری کے لئے خیر بہت سی شرطیں ہیں۔ ریاستوں میں روزگار تلاش کرو۔ ایک مرتبہ لگ جانا شرط ہے یہ سمجھ لو کہ جاگیر ہو گئی میرا جواب عموماً یہی ہوتا کہ جناب میں ایسی قسمت ہی لے کر نہیں آیا" آخری مرتبہ جب ان سے ملاقات ہوئی ہے تو انھوں نے کوشش کا وعدہ کیا تھا۔ ایک بات تھی ہو گئی۔ اپنی پریشانیوں میں مجھے ان کا خیال بھی نہ رہا۔

ایکدن ظہر کی نماز مسجد میں پڑھ کر میں اپنے گھر آ رہا تھا کہ ڈاکیہ نے ایک خط دیا میری کسی سے خط و کتابت نہ تھی۔ متعجب ہو کر اپنا نام پتہ دیکھنے لگا۔ یہ تو نہ کھلا کہ بھیجنے والا کون ہے۔ البتہ اتنا معلوم ہوا کہ آگرہ سے پتہ بدل کر یہاں آیا ہے جلدی جلدی لفافہ کھولتا ہوا گھر میں آیا۔ تحریر غیر مانوس مگر مضمون دردمندی سے بھرا ہوا۔ لکھا تھا" عزیزی حافظ صاحب سلمہٗ تم تو شاید بھول گئے ہو لیکن میں تمہیں نہیں بھولا۔ کئی مہینے کی جدوجہد کے بعد آج خدا نے مجھے تم سے سرخرو

ہونے کا موقع دیا ہے۔ فی الحال پچاس روپے ماہوار کی اسامی تمہارے واسطے تیار ہے۔ فوراً اپنا بوریا بستر باندھ کر سوار ہو جاؤ" بڑی دیر سوچنے کے بعد یاد آیا کہ اچھا فلاں صاحب ہیں" اچھے دن آگئے تھے' دل نے محبت بھی پیش کی سجدۂ شکر ادا کیا کہ دیتا ہے تو یوں چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے اور دوسرے ہی روز خط میں لکھے ہوئے پتے پر روانہ ہو گیا۔ ایک دفعہ نصیب جاگا سو جاگا۔ آدمی چلا اور چلا تھوڑے عرصہ کے بعد میری جڑیں مضبوط ہو گئیں تو میں نے دوسری شادی کی۔ خدا نے پے در پے بچے بھی دئے۔ القصہ جو کچھ میری پہلی بیوی نے عالمِ خواب میں کہا تھا جیسے جاگتے پورا ہوا۔ اب سوچ ہے تو صرف یہ کہ دیکھئے مرنے کے بعد کیا گزرتی ہے۔

خواجہ شریف

خواجہ شریف غدر ۵۷ء کے تباہ شدہ بختیوں کی یادگار ہیں۔ لڑکپن امارت کی جھوٹی شیخیوں میں گزرا وقت کی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ زمانے کو ٹھکراتے رہے۔ جوانی آئی تو شورشوں سے لبریز۔ وطن سے نکلنا پڑا۔ آج سے چالیس برس پہلے زمانے کی حالت ایسی نہ تھی جیسی آج ہے۔ دلی والے ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ریاستوں میں خاندانیوں کی قدر تھی۔ جہاں لگے آؤ بھگت ہوئی۔ من مانی نوکریاں ملیں مگر بدمزاجی سے کہیں دو برس بھی گزارا نہ ہوا۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔ دنیا کے حالات کبھی یکساں نہیں رہے پرانے خیالات کے رئیس مرتے گئے۔ نئے جو برسرِ حکومت ہوئے وہ دوسرے رنگ کے تھے۔ خواجہ صاحب کی قیمت کا انھیں کیا اندازہ۔ آخر یہ روزگار سے ناامید اور خانہ بدوش زندگی سے اکتا کر گھر آ بیٹھے۔

گھر میں کیا رکھا تھا۔ باپ مر چکے تھے۔ کہنے کو کنبہ بڑا۔ بھائی بھی بہنیں بھی۔ لیکن سب کھاؤ بیر۔ تر نوالے کھا کر غرانے والے۔ بے ڈھنگے۔ کمانا تو ایک طرف دوسرے کی کمائی کو بھی سلیقے سے صرف کرنا نہ جانا۔ خواجہ شریف آئے تو انھیں خیال تھا کہ ماں نے کچھ نہ کچھ ضرور جوڑ رکھا ہوگا۔ آخر برسوں بسیج دو دو

سو تین تین سو روپے ماہوار بلا ناغہ بھیجتے رہے اس کا کوئی ثمرہ تو ملنا چاہیئے آکر دیکھا تو چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں ؟ الٹی قرض داری۔ اس پر طرہ یہ کہ اماں جان نے بیٹے کے لئے بہو تلاش کر رکھی تھی۔ گھر میں قدم رکھنا تھا کہ شادی کی تیاری ہونے لگی۔ عورتوں کو اپنی خوشیوں کے مقابلہ میں کچھ نہیں سوجھتا۔ ایک ماں کی سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ بیٹے کی سہرا دیکھے۔ بہو بیاہ کر لائے۔ خواہ اینٹ کا گھر مٹی کا ہو جائے۔ دوسرے ہی دن سے جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ انھیں انجام کار سے کیا واسطہ؟ حالات کی سازگاری ناسازگاری کو ان کی بلا دیکھے۔ ان کے ارمان پورے ہونے چاہیئں۔

دس پانچ دن تو میاں شریف آئے ٹالے دیتے رہے ان کو اپنی مالی حالت معلوم تھی۔ سامنے بھی کوئی آمدنی کا ذریعہ موجود نہ تھا۔ جوانی کے ولولے ختم ہو چکے تھے۔ چالیس بیالیس برس کی عمر میں شادی کی کیا خوشی۔ دوسرے ماں باپ کی پسند کی پہلی بیوی سے کب نباہ ہوا تھا جو اب دوبارہ ویسا ہی پھندا گلے میں ڈالتے۔ لیکن یہ گو مگو آخر کب تک رہتی۔ ایک روز ماں جان نے پکڑ ہی لیا۔

والدہ:۔ کیوں بھئی تم نے یہ کیا وطیرہ اختیار کیا رکھا ہے۔ صاف جواب کیوں نہیں دیتے۔

شریف:۔ کس بات کا؟

والدہ:۔ ایسے نخرے شادی کرنی ہے یا نہیں۔ میرے دم کا کیا بھروسہ۔ آج مری کل دوسرا دن۔ میری آنکھوں کے سامنے یہ گھر آباد ہو جائے۔ تو اچھا ہے۔

شریف:۔ اماں جان۔ بڑھاپا آ گیا اب شادی کیا کروں گا۔ دوسروں کی شادیاں کر دو ان کی دلہنیں لاؤ۔ گھر آباد ہو جائے گا۔

والدہ:۔ چل بڑھاپا آئے گا تیرے دشمنوں کو۔ اب تو خدا رکھے شادی کے دن

آسکتے ہیں۔

شریف :۔ مگر میں تو اب اپنی عمر شادی کے قابل نہیں سمجھتا۔ ایک دفعہ شادی ہوئی تھی ہو چکی۔

والدہ :۔ کیا دشمن مر تو نہیں رہے۔

شریف :۔ (جھینپ کر) آپ جو کچھ چاہیں سمجھ لیں۔

والدہ :۔ کہنے والا پہلے ہی ہیجڑا کہنے لگے ہیں۔ کیا ان کا کہنا سچ کرائے گا۔

شریف :۔ کہنے کی زبان کون پکڑتا ہے۔ اچھا یوں ہی سہی۔ میں نہیں کرنا چاہتا۔

والدہ :۔ میں یوں ہی ترستی ہوئی مر جاؤں۔ پوتا پوتی نہ کھلاؤں۔ تیرا کیا ہے لوگ تو مجھے کچو کے مارتے ہیں کہ بیٹے کی شادی نہیں کرتیں۔ خدا جانے کیا جوگ ہے۔

شریف :۔ دوسرے بیٹوں کے بیاہ کرو۔ پوتے پوتیاں کھلاؤ۔ کس نے منع کیا ہے۔

والدہ :۔ اور سب سے بڑا رنڈہ اچھڑا رہے۔ تمہارے بچے نہ دیکھوں۔

شریف :۔ میرے نصیب میں بچے ہوتے تو پہلی بیوی بھی تو نو برس رہی تھی اس کے نہ ہو جاتے۔

والدہ :۔ اس کی کوکھ کو تو جھلا لگ گیا تھا۔ رات دن کی بیمار۔ کہیں ایسی جنم جلیوں کے ہاں بچے ہوتے ہیں۔

شریف :۔ کیا خبر ہے یہ دوسری بھی ویسی ہی ہو۔

والدہ :۔ نوج دور پار ...... خیر میں نے تو ہاں کر لی ہے۔

شریف :۔ واہ رے سوز۔ خواہ مخواہ آپ نے ہاں کر لی۔

والدہ :۔ ایسے موقعے روز روز تھوڑی ملتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے لوگوں کا منہ کالا کرنا ہے۔

شریف :۔ آپ نے مجھ سے تو پوچھا ہوتا۔

والدہ :- تم سے پوچھنے کی کیا ضرورت؟ پہلے پوچھا تھا جواب پوچھوں۔
شریف :- آپ غضب کرتی ہیں۔ پہلے کی بات پہلے کے ساتھ گئی۔ اس وقت مجھے سمجھ کب تھی۔ پھر بھی آپ نے دیکھ لیا۔ جیسا کچھ اس کا حشر ہوا۔
والدہ :- پھر بھگتا بھی تو ہم نے اور میرے نزدیک تو آج بھی تم ویسے ہی ہو۔
شریف :- اماں جان! آپ کی اس سادگی کو کیا کہوں۔ وہ وقت اور تھا یہ وقت اور ہے۔ سچ پوچھئے تو اب میں پہلے کی طرح آنکھیں بند کر کے شادی کرنا نہیں چاہتا
والدہ :- ہوش کی دواؤ میاں۔ مجھ سے زیادہ تم ان باتوں کو کیا جانو۔
شریف :- اچھا کہاں بات چیت ہو رہی ہے۔
والدہ :- دو جگہ پیام بھیجے ہیں اور دونوں راضی ہیں منہ میٹھا کرنے کی دیر ہے۔ اب تم جہاں ہو بات پکی کر لی جائے۔
شریف :- وہ دونوں کون ہیں؟
والدہ :- ایک تو نواب حسین خاں۔ چار بھائیوں میں ایک بہن ہے۔ نامی امیر ہیں گاؤں گویں۔ باغ باغیچے۔ مکان دکانیں۔ گھر میں بہو بھی بچھی آئے گی اور دوسرے مولوی محمد رضا۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا چٹ پٹ ہو گیا ہے دوسری کنواری ہے وہ چاہتے ہیں کہ بڑی سے ہو گر چھوٹی کو کہہ رہی ہوں۔
شریف :- مجھے دونوں جگہ پسند نہیں۔
والدہ :- کیا نی ہے؟ کیوں پسند نہیں؟
شریف :- نواب صاحب کا اور ہمارا کیا جوڑ؟
والدہ :- ان کے پاس دولت ہے تو ہمارے پاس ہڈی بوٹی رچکے سے، جہیز سے گھر بھر جائے گا۔ ایک بیٹی ہے۔ ماں باپ بھائیوں سب کی آنکھوں کا تارا۔ جو کچھ نہ دیں کم ہے۔ سو روپے کے کرائے کی جائداد بھی لائے گی۔

شریف :- جب ہی تو میں کہتا ہوں کہ ہماری ٹکر نہیں۔

والدہ :- تم نے ہمیشہ بھری رکابی پر لات ماری۔ ارے آئی دولت کو ٹھکرایا نہیں کرتے۔

شریف :- اماں جان۔ امیروں کی بیٹی لانا کیا آپ نے آسان سمجھ لیا ہے اس کے ناز نخرے کون اٹھائے گا؟

والدہ :- جو گھوڑا دے گا وہ جوڑا بھی دے گا۔ وہ اپنی بیٹی کے آرام کا خود خیال رکھیں گے۔

شریف :- آپ تو پرانے زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔

والدہ :- اچھا میں نے مانا کہ وہ کچھ نہیں کریں گے۔ لیکن کیا انھیں ہمارا حال معلوم نہیں۔

شریف :- وہ دھوکے میں ہیں۔

والدہ :- میاں! عقل کے ناخن لو۔ دھوکا کیسا۔ میں صاف کہہ چکی ہوں کہ لڑکا ہی لڑکا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

شریف :- آپ چاہتی ہیں کہ میں بیوی اور اس کے سارے کنبے کا غلام بن رہوں یا پہلے کی طرح گھر سے نکل جاؤں۔

والدہ :- میں پوچھتی ہوں آخر تمہیں امیر گھرانوں سے نفرت کیوں ہے؟

شریف :- میں امیروں کی بیٹیوں کو پسند نہیں کرتا۔ کم حیثیت شوہر کی ان کے ہاں عزت نہیں ہوتی۔ ذرا سی بات ہوئی اور ڈولی تیار ہے۔ بوریے بندھ جاتے ہیں۔ سسرے صاحب الگ غرائیں۔ سالے صاحب آستین چڑھائے موجود۔

والدہ :- شریفوں میں تو جیسے ایسا ہو۔

شریف :- شریف امیروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ نازوں کی پلی لڑکیاں گھر بنانا

کیا جانیں۔ نہیں اپنے مطلب سے مطلب۔ ان کی جوتی سے کسی کو تکلیف پہنچے یا راحت۔ خاوند کی خوشی کرنا وہ اپنی ذلت سمجھتی ہیں۔

والدہ:۔ بھئی تمہاری جہالت کا میں کیا جواب دوں۔ اچھا مولوی صاحب کی بیٹی کی نسبت کیا کہتے ہو۔

شریف:۔ مولوی صاحب کی بیٹیاں سنا ہے بڑی خرد ماغ ہیں اور زبان دراز ایسی کہ خدا کی پناہ! ماں باپ کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ بیچاروں کا بس نہیں چلتا کہ زہر دے دیں۔

والدہ:۔ بس بھئی معلوم ہوا کہ تمہارا شادی کا ارادہ ہی نہیں۔ لوگ سچ کہتے ہیں!

شریف:۔ لوگ تو خیر سچ کہتے ہیں یا جھوٹ، اگر آپ ذرا تحقیق تو کریں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ جھوٹ ہے یا سچ۔ بڑی لڑکی کا برس ہی دن کے بعد چھوٹ چھاؤ کیوں ہوا۔ آپ کو کچھ خبر ہے؟

والدہ:۔ ہاں سنتی ہوں کہ میاں ظالم تھا۔ نہ کہیں آنے دیتا نہ جانے دیتا۔ ہمسائیوں تک سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ سارا گہنا پاتا اتار کر رکھ لیا۔ ساس ایسی لڑاکا کہ بات بات پر کھائے جائے۔ نہ رونے دے نہ ہنسنے۔ اس کے آتے ہی اس کو نکال دیا۔ وہ عمر بھر کی خدمت کرتی پھر بھی ہر وقت کی فضیحتی۔ آخر کب تک سہار ہوتی۔ بیچاری میکے میں آ بیٹھی۔

شریف:۔ یہ تو آپ نے لڑکی والوں کی سنی۔ وہ اور کیا کہہ سکتے۔ لوگوں کو دوسروں کو پرچھدا دکھتا آتا ہے۔ بھلا کوئی بھی اپنا گھر بسا کر اجاڑنا چاہے گا،

والدہ:۔ پھر برسوں سے گھونگھٹ میں چٹکیاں لی ہوں گی؟

شریف:۔ اور کیا۔ آپ کیا جانیں۔ ان کے ہاں کی عورتیں مردمار ہیں۔ دوسرے تیسرے دن تو پردہ باغ میں جائیں۔ بائسکوپ وہ تماشے دیکھیں۔ منع کرو تو لٹھو لیں

خرافاتیں سنو۔
والدہ:۔ اے بھئی توبہ کرو۔ مولوی کی بیٹیاں ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔
شریف:۔ ہو سکتا کیا معنی؟ سارے محلہ والے جانتے ہیں۔ پھر گھر کو بھٹیار خانہ بنا دیا تھا۔ میاں کو بولنے کی مجال ہی نہ تھی۔ ساس نے ذرا سا کچھ کہا اور جان کو آ گئیں جیسے کسی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ پکانا ریندھنا کیسا۔ بازار سے حلوا پوری کچوری منگائی اور ناشتہ تازہ کیا اور بیٹھ رہی۔ دوسرے فاقے سے بیٹھے رہیں اس کی پاپوش سے۔ میاں تو خیر جوتی کے برابر بھی نہ تھے۔ ساس کو ایک دن چبوترے پر سے ایسا دھکا دیا کہ غریب کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ بھلا جس عورت کے ایسے طور ہوں وہ کسی بھلے آدمی کے گھر میں رہ سکتی ہے۔
والدہ:۔ ہے ہے کیا یہ سچی باتیں ہیں۔ توبہ جو ایسی بہو کسی کے گھر میں آئے۔
شریف:۔ اگر ان کے یہ ڈھنگ نہ ہوتے تو آج تک کیوں بیٹھی رہتیں۔ دونوں میں سے ایک کو بھی خصم نہ جڑتا۔ چھوٹی کی عمر آپ کیا سمجھتی ہیں۔ چھبیس ستائیس برس سے کم نہیں۔
والدہ:۔ (منہ بنا کر) اچھا ان دونوں جگہ جانے دو۔ بیٹوں کی شہر میں کیا کمی۔ کئی لڑکیاں اور بھی میری نگاہ میں ہیں۔
شریف:۔ ذرا بات ٹالنے کے طور پر آپ کو اختیار ہے لیکن ذرا دیکھ بھال کیجئے گا۔ مجھے آپ کے امیر اور ایسے خاندان شریف نہیں چاہئیں جن سے راحت کے بدلے تکلیف پہنچے۔ اب شوق رہا ہیں۔

خواجہ صاحب سمجھتے تھے کہ بات ٹل گئی مگر بڑی بی کب چھوڑنے والی تھیں۔ آخر انھوں نے ایک اور جگہ پھانس لگائی۔ یہ لوگ تھوڑے ہی عرصہ سے منظر عام پر آئے تھے۔ رشتہ داروں کے بڑے بڑے نام جن

یہ مولوی صوفی بھی تھے اور سرکاری عہدے دار خطاب یافتہ بھی۔ میاں شریف کے منہ میں پانی بھر آیا۔

والدہ :- ہاں بھئی ایک کاغذ جس میں لڑکی کے باپ دادا اور چچاؤں وغیرہ کے حالات تھے دکھا کر، یہ جگہ کیسی ہے۔

شریف :- میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا۔ آپ تحقیق کریں۔ چچا جان کی کیا رائے ہے۔

والدہ :- یہ بات ہی وہ لائے ہیں۔ ان سے کیا پوچھنا۔

شریف :- کیا عرض کروں؟

والدہ :- اپنی عرض ورض رہنے دو۔ میں بات پکی کر لیتی ہوں۔

شریف :- لڑکی کو بھی دیکھا ہے۔

والدہ :- تمہاری بہن دیکھ آئی ہیں۔

شریف :- کیسی ہے مجھے بھی تو بتائیے۔

والدہ :- کانڑی نہیں لولی لنگڑی نہیں۔ آدمی کا بچہ ہے۔ دبلی پتلی کاہنی سی ہاں رنگ اجلا نہیں۔

شریف :- کالی ہے!

والدہ :- کالی خدا نہ کرے کیوں ہونے لگی۔ کوئی شیدیوں کا خاندان ہے۔

شریف :- مجھے دکھادیں گے؟

والدہ :- اب دیوانوں کی سی باتیں تو کرو نہیں۔ شریفوں میں دیکھنا دکھانا کیسا جن کو دیکھنا تھا انھوں نے دیکھ لیا۔

شریف :- میری کئی شرطیں ہیں۔ وہ منظور کریں گے؟

والدہ :- معقول ہوں گی تو کیوں نہیں۔

شریف:۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ لڑکی کو مجھے دکھا دیں۔
والدہ:۔ جو اس بھی درست ہیں۔ میاں اللہ اللہ کرو۔ شریفوں کی بیٹی ہے۔ یا بازار کی بیٹھنے والی۔ آئے گی تو آخر تمہارے ہی گھر میں۔ جی بھر کے دیکھ لینا
شریف:۔ کہنے میں کیا ہرج ہے۔
والدہ:۔ میاں وہ بات منہ سے نکالو جو بھلے آدمیوں میں ہوتی آئی ہے صورت دیکھ کے کرنی ہے تو کسی کوٹھے والی سے کرو۔
شریف:۔ اماں جان صورت کا مجھے دیکھنا نہیں۔ صورت کے چاؤ تو جوانی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اب تو سیرت دیکھنی ہے۔ مرنے بھرنے والی ہو۔ جو گھر کو گھر سمجھے۔ شوہر کو شوہر اور ساس نندوں کو ساس نندیں جانے۔
والدہ:۔ پھر یہ حال تو برتنے سے معلوم ہوتا ہے۔
شریف:۔ صورت دیکھ کر بھی بہت سی باتوں کا پتہ لگ جاتا ہے۔
والدہ:۔ چلو۔ بڑے شکل دیکھ کر پتہ لگانے والے۔ میاں یہ سب نصیب کی باتیں ہیں۔ اندر کے گنوں کی کسی کو کیا خبر۔
شریف:۔ آپ جانیں۔ اگر میری مرضی کے خلاف نکلی اور میں اس کے ساتھ گزارا نہ کر سکے۔ تو آپ شکایت نہ کیجئے گا۔ میرا مزاج اور میری عادتیں آپ جانتی ہیں۔
والدہ:۔ بھئی تو پھر تم چاہتے کیا ہو۔
شریف:۔ میں اول تو سرے سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتا اور چاہتا ہوں تو ایسی کے ساتھ جو صحیح تربیت یافتہ ہو۔
والدہ:۔ انگریزی پڑھی لکھی۔
شریف:۔ نہیں!

والدہ :۔ اور کیسی ہو ؟ ساڑھی باندھے کھٹ کھٹ کرتی ؟

شریف :۔ نہیں ؟

والدہ :۔ نواب زادی ۔ پیر زادی ۔

شریف :۔ نہیں ۔

والدہ :۔ پھر کیا عرش سے اترے ؟

شریف :۔ آج کل ہم جیسے نیم شریفوں کو نہ بالکل آٹے کی آپاؤں کی ضرورت ہے نہ ایسی تیز طراروں کی ۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی کسی کام کی نہیں ۔ ورجہالت کا کندہ بھی کسی مصرف کا نہیں نہ اتنی پردہ دار اور سڑیل چاہیئے کہ عذاب بن جائے نہ اس قدر آزاد اور بننے سنورنے والی کہ آئینہ کے سوائے کچھ اور دھندا ہو ۔ یہ میں جانتا ہوں کہ آپ اپنے خیال سے اچھا گھرانہ بھی تلاش کرلیں گی ۔ آسودہ حال کھاتا پیتا ان کا شجرہ نسب بھی بے داغ ہوگا ۔ صورت شکل بھی بری نہ سہی ۔ لیکن اماں جان ! یہ سب چیزیں شادی کا اصل مقصد پورا نہیں کرتیں ۔

والدہ :۔ شادی کا اور مقصد کیا ہے ؟ یہی نا کہ گھر آباد ہو ۔ بچے ہوں نسل چلے ؟

شریف :۔ گھر آباد ہو مگر جنت بن کر ۔ بچے ہوں تو ان کی پرورش اور تربیت کا بھی تو سلیقہ ہونا چاہیئے ۔ اگر جنت کی بجائے گھر دوزخ بن گیا اور بچے ہوئے تو ارشاد فرمائیے ایسی صورت میں گھر آباد ہو گیا یا برباد ۔ میرے اندر اب برداشت کی قوت نہیں رہی ہے ۔ میں نہ نری فیشن ایبل بیوی کے ساتھ گذارہ کرسکتا ہوں نہ محض بچے کشی کی مشین چاہیئے جو عورت ایک عورت کے فرائض ادا کرنے کی قابلیت رکھتی ہے ۔ شوہر کی خوشنودی کو اپنا نصب العین بنا سکے ۔ جس حال میں ہو خوش رہے ۔ بیگم کے وقت پر بیگم ۔ باورچن کے وقت باورچن ۔ معلمان کے وقت معلمانی اور خدانخواستہ دورے تو دایہ ۔ اتالیق اور کھلائی غرضکہ جیسی ضرورت پڑے

عذرو یسی بن جائے۔ مجھے تو ایسی بیوی چاہیئے۔ آپ بھی غالباً ایسی ہی ہو پسند کرینگی
والدہ :۔ میاں اللہ میں سب قدرت ہے۔ تم اپنی نیت درست رکھو۔ سو ایک بات تو یہ جانتی ہوں کہ شریفوں کی بیٹیاں دغا نہیں دیتیں۔ اب رہا یہ کہ وہ آتے ہی تمہارا مزاج پہچان لے۔ بھلا کیسے ہو سکتا ہے تمہارے گھر میں آئے گی تم اپنی مرضی کے مطابق اسے بنا لینا۔

شریف :۔ لیکن بننے کی قابلیت ہونے کی تو ضرورت ہے۔

والدہ :۔ تو کیا وہ جانوروں میں پلی ہو گی اپنے گھر میں بھی تو آخر اس نے کچھ سیکھا ہو گا۔ خدا نہ کرے گوڑی ناحق تو نہیں۔

شریف :۔ آپ کو اطمینان ہے تو بسم اللہ کیجئے۔

والدہ :۔ اور دوسری شرطیں کیا ہیں؟

شریف :۔ اور شرطیں تو ایسی زیادہ سخت نہیں۔

والدہ :۔ آخر؟

شریف :۔ سہرا نہیں باندھوں گا۔ گھوڑے پر بیٹھ کر نہیں جاؤں گا۔ کوئی کاغذ نہیں لکھوں گا۔ مہر پانچ ہزار سے زیادہ مجھے منظور نہیں۔ جہیز جو کچھ دینا ہے چھکڑے پر لاد کر بھیج دیں۔ دلہن کی پالکی کے پیچھے پیچھے چماریوں کی قطار نہ ہو۔

والدہ :۔ سبحان اللہ! اپنی خوشی میں تم کھنڈت ڈالنے والے کون۔ تمہاری خالہ کی دوسری بہو ہے۔ ان کی بیٹی کا تو اللہ رکھے پہلا بیاہ ہو گا۔ وہ اپنے ارمان ضرور نکالینگے

شریف :۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری فضول رسمیں پوری کرنی ہوں گی؟

والدہ :۔ اور کیا نہیں بھی۔ ڈومنیاں بھی گائیں گی۔ ڈنے ٹونکے بھی ہوں گے (مسکرا کر) بیوی میں تمہارا غلام ہوں آنکھیں کھولو" بھی کہنا پڑے گا۔

شریف :۔ کتنا نخور دماغ ہے!

والدہ :۔ تمہارے نو کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ دلہن آسان نہیں۔
شریف :۔ اماں جان آپ سوچئے تو اس عمر میں یہ بچوں کی سی باتیں کہاں تک مجھے زیب دیں گی۔
والدہ :۔ دولہا پانچ برس کا ہو یا سو برس کا کہلاتا دولہا ہی ہے اور دولہا کی ساری باتیں کرنی پڑتی ہیں۔
شریف :۔ مگر بات طے کرتے وقت ان سے کہنا تو چاہیئے۔ وہ لوگ معقول پسند ہوں گے تو ضرور پسند کریں گے۔
والدہ :۔ دو چار دن میں وہ تمہیں دیکھنے کے لئے بلانے کو کہتے ہیں اس وقت اپنے چچا سے کہہ دینا وہ اپنے طریق پر ان باتوں کا بھی ذکر کر دیں گے۔

ہونے والی بات، نہ جانے بیٹی والوں کو میاں شریف میں کیا لال چمکتے ہوئے نظر آئے کہ جو کچھ انھوں نے کہا مان لیا۔ حتیٰ کہ نکاح سے پہلے سامنے کرنے پر بھی تیار ہو گئے۔ لڑکی کی ماں نے کہلا بھیجا کہ باتوں سے بیٹیاں پرائی ہوتی ہیں۔ دیکھنا ہی چاہتے ہو تو بسم اللہ اندر آ جاؤ۔ عیب دار ہماری اور بے عیب تمہاری۔ یہ ایسا فقرہ تھا کہ شریف صاحب کو گردن نیچی کرنی پڑی چلتے ہوئے لوگوں کی باتیں ہی تو ہوتی ہیں۔ خاموشی برتاؤ کام کر گئے۔ بات پکی ہونے میں اب کیا کسر تھی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ مہینہ کے اندر اندر شادی کی تیاری ہو گئی۔ تیاری کیا تیسرے ہفتے نکاح ہو گیا۔

ہندوستانی ماحول کی ساختہ پرداختہ لڑکی تھی۔ آتے ہی کیا اس کے گن کھلتے۔ مہینوں تک تو دلہن ہی بنی رہی۔ ساس نندیں موجود تھیں۔ گھونگھٹ اٹھنے کے بعد جب خانہ داری شروع ہوتی ہے تو سبھاؤ دیکھنے کی نوبت آتی ہے یا خدا نہ کرے کوئی ایسی ہی نوبت آ جائے جس میں چھیڑ کھٹ چھوڑنا ہی ناگزیر

ہو۔ میاں سب کو معلوم ہے کہ بے روزگار تھے۔ شادی منت میں تو ہو رہی نہیں کر لی۔ نہیں نہیں کر کے بھی ہزار روپے کا پھندا گلے میں پڑ گیا تھا۔ پھر بچے کتا پالتے ہیں تو اس کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ تو گھر میں بیوی آئی تھی اخراجات بڑھ جانے میں کیا شک ہے۔ تیسرے چوتھے مہینے ہی میں ہاتھ تنگ ہونے لگا۔ آمدنی کی کوئی شکل نہیں۔ خرچ اجلے۔ بھائی شوربہ پشت کھانے اور غرانے والے۔ سہارا دینے کے نام سے دور بھاگیں بہنیں فضول خرچ۔ مہانوں کی طرح آئیں اور باتیں بنائی چلی جائیں۔ گھر کی مالک ماں۔ اچھا کھانے اور اچھا کھلانے میں حاتم مگر جس کے دم سے گھر چل رہا ہے اس کے حال سے بے خبر۔ ان کی بلا سے لانے والا کہیں سے لائے۔ لائے اور ان کی مٹھی گرم کر دے۔ پھر یہ بھی نہ پوچھے کہ کیا کیا۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ اولاد میں جو کمانے والا اور کنبہ پرور ہوتا ہے اسی کی کمبختی زیادہ آتی ہے۔ جہاں اس نے کسی وجہ سے دینے میں کمی کی یا دینے کی توفیق نہ رہی۔ ساری عمر کا دیا لیا اکارت۔ سارا کھلایا پلایا ملیا میٹ گویا ان لوگوں کبھی دیا ہی نہ تھا۔ اور تو اور اپنے خون۔ ماں باپ بہن بھائی تک رنگ بدل لیتے ہیں۔ ایک صرف بیوی آج کل کی ہری جگ نہیں۔ پرانے زمانہ کی وہ بھی کسی شریف کی جائی۔ مرنے بھرنے والی ساتھ دے دے تو دے دے ورنہ حالات کا تغیر بھی میں اپنے درجہ کے مطابق تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ شریف صاحب بھی اس چیلش میں مبتلا ہو گئے۔ اب وہ بیوی والے ہو گئے تھے۔ خدا نے اولاد کی امید بھی لگا دی تھی۔ اکیلا دم تھا تو جو کچھ کمایا۔ گھر میں ٹھایا۔ ماں کو بہن بھائیوں کو سدا ابھرا۔ ایک ایک کو عیش کرائے بیکاری میں اپنی آبرو سنبھالنے بیوی کی ضرورتیں پوری کرتے یا الفتوں کی بھینٹ چڑھاتے۔ تیس چالیس روپے کی اوقات ہی کیا۔

اونٹ کے منہ میں زیرا۔ قسم پشم گزر رہی تھی جس نے ہزاروں کمائے اور جن کے ٹکڑے میں گھسا دیے ان سے الٹ کر نہ پوچھا کہ کہاں کھوئے۔ وہ اس مختصر آمدنی میں کس کس کی تواضع کرتا۔ پھر ایک دو ہوں تو خیر۔ تین تین بہنیں پانچ بھائی اور سب کے سب نوچے کھسوٹنے والے۔

مثل مشہور ہے کہ ایک ہو تو اس کا منہ موتیوں سے بھی بھر دے دس کا منہ تو راکھ سے نہیں بھرا جاتا۔ تنگی ترشی ایک دن حد کو پہنچ گئی تو ایک دن اماں کو علیحدہ بٹھا کر کہا۔

شریف:۔ آپ نے شادی کرکے میری اچھی بھلی جان کو روگ لگا دیا۔

والدہ:۔ دشمنوں کے دیدوں میں خاک تو پڑ گئی۔ ذرا جیتا جاگتا بچہ ہو جائے۔ پھر دیکھنا جو یہ کہتے تھے کہ شریف عورت کے قابل نہیں۔ انھیں کیسا ذلیل کرتی ہوں۔

شریف:۔ ایسا کرنے سے کیا ہوگا۔ کہنے والے کہیں گر مجھے تو یہ سانا ہے کہ یہ بیل کس طرح منڈھے چڑھے گی۔

والدہ:۔ کونسی بیل؟

شریف:۔ گھر کا خرچ بڑھتا جاتا ہے اور آمدنی کا کوئی دروازہ نہیں کھلتا۔

والدہ:۔ پھر؟

شریف:۔ آپ ذرا سوچ سمجھ کر اٹھائیں یا اوروں سے کہیں کہ وہ بھی ہاتھ پاؤں ہلائیں۔ سارے گھر کا بوجھ ایک مجھ پر ہی ڈالنا تو اچھا نہیں۔

والدہ:۔ تم ہی آج تک اٹھاتے آئے ہو۔ تم ہی اٹھاؤ گے۔

شریف:۔ جب تک میرا روزگار تھا اٹھایا۔ اب نہیں ہے تو کیا کروں۔

والدہ:۔ میں کیا بتاؤں۔ جیسا کیا ویسا بھرو۔

شریف:۔ آپ دوسروں سے کیوں نہیں کہتیں۔ ان کا بھی تو کچھ فرض ہے۔؟

انہیں بھی تو آخر کچھ کرنا چاہیئے۔ یا میں ہی بڑ ہاں چلے جاؤں۔

والدہ :۔ تم بڑے ہو۔ خود کیوں نہیں کہتے۔

شریف :۔ آپ کے ہوتے میرا کچھ کہنا مناسب نہیں۔

والدہ :۔ میں تو کچھ نہیں کہوں گی۔

شریف :۔ اور جو کل میں مر گیا تو کیا ہوگا؟

والدہ :۔ جو جن پر پڑے گی، اٹھائیں گے۔

شریف :۔ اس وقت سے پہلے کیوں نہ انتظام ہو جائے۔

والدہ :۔ مرنے سے پہلے کوئی کسی کو مرا ہوا نہیں سمجھ لینا۔

شریف :۔ تو آپ بھی مجھ پر رحم کھانے کے لئے تیار نہیں۔

والدہ :۔ جو کچھ سمجھو۔

شریف :۔ اماں جان آپ سے مجھے یہ امید نہ تھی میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر میرا گلا گھونٹتے ہوئے آپ کو ترس نہیں آتا۔

والدہ :۔ تمہاری مرضی ہے کہ میں ان کو نکال دوں۔ جیسے تم دیسے وہ۔ تمہارا لہو سفید ہو گیا ہے میرا تو نہیں ہوا۔ مجھے تو سب آنکھیں برابر ہیں۔

شریف :۔ نہ میرا لہو سفید ہوا ہے نہ آپ کا۔ مگر۔

والدہ :۔ اگر مگر کو میں نہیں جانتی۔ میں سمجھ گئی۔ اس مسی نے تم کو بھڑکایا ہے۔

شریف :۔ ہائیں ہائیں وہ غریب نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ اسے آپ کیوں بیچ میں سانتی ہیں۔ خواہ مخواہ کسی کا سر پیٹنا۔

والدہ :۔ میاں میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے۔ خیر وہ بھی اچھی تم بھی اچھے بری تو میں ہوں۔ میرا گلا گھونٹ دو۔ سارے پاپ کٹ جائیں گے۔ سب بہن بھائی میرے ہی دم کے ساتھ ہیں۔ میں نہ ہوں گی تو کوئی بھی نہ ہوگا۔ جو جی چاہے

کرنا۔ یا چلو میں بجھتے جی اپنا منہ کالا کر لیتی ہوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ دونوں میاں بیوی آنند کے تار بجانا۔ میرا ہی جھمیلا ہے نا تو میں آج نکل جاؤں گی۔

شریف:۔ میں نے ناحق آپ سے یہ ذکر چھیڑا۔

والدہ:۔ ناحق کیوں چھیڑا۔ اب تمہارا ہم سے جی بھر گیا ہے۔

شریف:۔ توبہ توبہ آپ کیا فرماتی ہیں۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ گھر کے اخراجات میں دوسرے بھی کچھ میرا ہاتھ بٹائیں۔ میرے اکیلے کی آمدنی کہاں تک۔ پورا ڈالے گی۔ کیا وہ کسی لائق نہیں۔ خدانخواستہ اپاہج ہیں؟ چاہیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں

والدہ:۔ بڑا بھائی موجود ہے تو ان کی جوتی کمالے۔ پہلے سے تم انھیں کسی دھندے لگاتے تو لگ بھی جاتے۔ تم نے تو خود ہی انھیں دے دے کر بگاڑ دیا

شریف:۔ یہ بھی میری خطا ہے۔

والدہ:۔ اور کیا؟ نہ تم ان کا مان مانتے نہ وہ آج ان دہاڑوں کو پہنچتے۔

شریف:۔ بھائی جو برائی ہے وہ میری ہی ذات میں ہے اور سب اچھے ہیں۔ اللہ کی مرضی خیر۔

یہ کہتا ہوا اور دل میں اپنی پچھلی حماقتوں پر افسوس کرتا شریف باہر چلا جاتا ہے۔ بظاہر تو معاملہ ٹھنڈا ہو گیا لیکن بات ایسی تھی کہ ادھر شریف صاحب کے دل میں گھر والوں کی گنجائش نہ رہی ان کے سامنے شادی کے نتائج تھے ادھر والدہ کا منہ ہاتھ پھولا رہنے لگا۔ بہنوں بھائیوں کی آنکھیں جدا پھری پھری نظر آنے لگیں ہر وقت چخ چخ۔ چھیڑ خانیاں ذرا ذرا سی بات پر فساد۔ اسی اثنا میں جاڑا ہوا کیسی خوشی۔ وہاں تو باپ مارے کا بیر تھا۔ میاں شریف نے خطا ہی ایسی کی تھی۔ بہنوں کو جاڑا اور نہیں آئیں۔ اماں جان بخار کا بہانہ کر کے کوٹھری میں جا پڑیں بھائیں

کا تو کہنا ہی کیا اور زادہ دشمن ٹھہرے۔ پاس پڑوس کی اگر دو چار ملنے والیاں نہ آجائیں تو بیچاری کا کوئی ڈھارس دینے والا بھی نہ تھا۔ کیونکہ جس وقت تک دلہن کی ماں بہنیں آئی ہیں یہاں لڑکی پیدا بھی ہو چکی تھی۔

چیونٹی جب دبتی ہے تو کاٹ کھاتی ہے۔ ماحول کا اثر ہوا یا جو سمجھو ایسی حالت میں مجبوراً شریف کو اپنا رویہ بدلنا پڑا۔ خون میں پانی کے اجزا بڑھنے لگے بالکل گھر سے تعلق قطع کرنا تو مشکل تھا۔ نکل کر کہاں جاتا اور کیا کرتا۔ اس لئے آمدنی میں اتنی گنجائش نہ تھی۔ ہاں چولہے الگ بن گئے۔ کدورت کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ لیکن بعض طبیعتیں قدرتاً روادار اور فراخ واقع ہوتی ہیں۔ شریف اب بھی اپنی حیثیت سے زیادہ سلوک کرتا اور یہ کوشش کرتا کہ اندر کا فساد باہر نہ نکلے۔ اپنی ضرورتوں کو پیچھے سمجھتا اور دوسرے کے آرام کا پہلے خیال رکھتا تاہم وہ برا کا برا ہی تھا اور برا کا برا ہی رہا۔ اس کے گناہ یہ تھے کہ بیوی سے ہنس کر کیوں بولتا ہے۔ اپنی لڑکی کو دیکھ کر کیوں باچھیں کھل جاتی ہیں وہ اگر بیوی کا کوئی کپڑا بناتا تو سب جل جاتے۔ وہ اپنی بچی کے لئے کچھ لاتا تو بہنیں کوکوں پر لوٹنے لگتیں۔ ماں جیسی بے لوث ہستی تک ہنکارے مارنے شروع کر دیتی

(ایک طرف تو بیچارہ شریف ان بلاؤں میں مبتلا خرچ اور آمدنی کا میزانیہ دیکھ دیکھ کر پریشان۔ دوسری طرف خانہ داری کا پورا بوجھ جو بیوی پر پڑا تو اس کے اصل جوہر بھی کھلے۔ معلوم ہوا کہ اس میں بچہ کشی کے سوا کسی طرح کی قابلیت نہیں حد درجہ کی پھوہڑ۔ ناسمجھ، ضدی اور نا کہا مان عورت ہے۔ سلیقہ چھو نہیں گیا۔ مزاج چڑچڑا۔ طبیعت گندی۔ خودرائے۔ سمجھاؤ تو الٹی سمجھے۔ ذرا سختی سے ٹوکا اور لڑائی کھٹوائی لے کر منہ لپیٹ پڑ گئی۔ بچے روئیں، چولہا اوندھا ہو، میاں فاقے سے رہے اس کو ٹسوے بہانے اور ہائے ہائے کرنے سے

مطلب - جان ضیق میں، زندگی عذاب ہوگئی۔ قہر درویش بجان درویش۔ تقدیر سے لڑا نہیں جاتا۔ گئے تھے نماز بخشوانے روزے گلے پڑ گئے۔ روتا۔ جھینکتا۔ پیٹتا اور چپ ہو رہتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے جو اس جیتے جی کی دوزخ سے چھٹکارا ملے۔ کئی مرتبہ بیوی سے لڑائی ہوئی ناگوار صورتیں پیش آئیں۔ پھر ملاپ ہوا۔ نرمی اور گرمی کے ساتھ سمجھایا۔ مگر وہی مثل ہے کہ جبل گردد جبلی نہ گردد۔ کتے کی دم کو نوے میں رکھ کر سو برس تک زمین میں داب رکھا اور پھر نکالا تو ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ چھوٹے دماغ کی عورت۔ کیا مجال جو اپنی بی سے باز آئی ہو۔ یہ بات نہیں کہ وہ جان کر میاں کو جلاتی تھی۔ اپنا گھر کوئی بگاڑنا نہیں چاہتا۔ قدرت نے اسے وہ مادہ ہی نہیں دیا تھا جو ایک عورت میں ہونا چاہیے یا پھر اس کی تربیت کے نقص تھے۔

ان ناخوش گواریوں کے ساتھ خدا کی شان روحوں کا جوڑ کھلا تو اوپر تلے پانچ بچے ہوگئے۔ مفلسی میں آٹا گیلا ہوا۔ چوہیا بل میں سماتے نہ تھے دُم کے پیچھے چھاج باندھ کر اور بھی تنگی ترشی سے گزرنے لگی۔ ہر سال جاپا، مہمانداریاں بیماریاں۔ آمدنی میں وہی پتلا شوربا اور گنی بوٹیاں۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ عورت بھی دھان پان۔ پہلے ہی دودھ کم۔ ایک پیٹ سے نکلا دوسرا پیٹ میں پڑا اب دودھ کہاں سے آئے۔ لامحالہ بازار کا دودھ پلانا پڑا اور یہ ایک چپت تھی جسے اٹھائے بغیر چارہ نہ تھا۔ مگر علاج کیا؟ جتنی روحیں آنی ہیں آکر رہیں گی۔ دروازہ بند کر دیا کھولو۔ بھیجنے والا زبردست ٹھیرا کسی کے روکے رک سکتی ہیں۔ ورنہ ستانی بستم می رسد۔ خوش ہو چاہے ناخوش۔

غرضکہ میاں شریف کی پریشانیاں ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ لڑکپن سے جوانی تک جیسی آزادی اور بے غمی کے ساتھ انھوں نے اپنی زندگی گزاری تھی اس کی ساری

کسر نکل گئی چھٹی کا دودھ یاد آگیا جس قدر روشن خیال بنتے تھے اسی قدر تاریکی میں پھنس گئے۔ جب گھر میں بیٹھتے پھول سے لپٹنے یہ محسوس ہوتا کہ شہد کی مکھیاں چمٹ گئیں۔ بیوی پر مکھیاں بھنکنے لگی تھیں۔ گھر کوڑی سے بدتر۔ بچوں کا برا درجہ میاں اپنی روٹی کا دھندا کرتے یا بچے پالتے۔ انا ماما رکھنے کی توفیق نہ تھی۔ بیوی چھوٹی موٹی کا درخت۔ پھر ایک ہو تو اس کی خبر لے۔ ماشاء اللہ پانچ بچے اور سب ناسمجھ۔ ماں کی گود کے طالب۔ رات کی نیند اور دن کا آرام حرام تھا۔ کس کو تھپکے کس کو دودھ پلائے۔ کس کا منہ دھلائے کس کے کپڑے بدلے۔ ہنڈیا ڈوئی کرے یا بچوں کی خدمت۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ چالیس برس کی عمر کے بعد شادی کرنا یتیم خانہ کھولنا ہے اور جب روزگار کا بھی ٹھکانہ نہ ہو تو آدمی زہر کھالے لیکن ایسا کام نہ کرے۔

شادی کرنا ہم نے مانا کہ ایک مذہبی فرض ہے بھیٹیل کی دنیا میں آبرو۔ قانون الٰہی کا چرچہ اور شادی کے بعد بچے ہونے بھی لازمی ہیں۔ زندگی کی باؤلی ہنڈیا چٹپٹی انہی سے بنتی ہے اللہ ہی نہ چاہے تو خیر۔ یا کسی کو ہنڈیا ہی نہ جڑے اور جڑے بھی تو مسالہ نہ ہو۔ اس کی سند نہیں ورنہ شادی کی اصلی رونق تو بچوں ہی سے ہے۔ خوشی کے ڈھول تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ذرا انسان اپنی جون میں رہے اور بالکل جانور نہ بن جائے تو لازم یہ ہے کہ ہوکا نہ کرے تھوڑے ضبط سے بھی کام لے کسان بھی جب تک ان کی پہلی بوئی ہوئی کھیتی کٹ کر بازار نہیں بک لیتی۔ دوسرا بیج ڈالنے سے باز رہتے ہیں اتنے میں زمین بھی اپنی قوت بہم پہنچا لیتی ہے اور اس کی محنت کا ثمر بھی مل جاتا ہے۔

بچے نعمت بھی ہیں اور مصیبت بھی۔ یہ سچ ہے نصیب والوں کے ہاں اولاد ہوتی ہے۔ لیکن نصیب کے لکھے کو اپنی جلد بازی سے مٹاؤ تو نہیں۔ بچے تو جتنے ہونے

ہیں۔ ہوں گے یہ کیا ضرور ہے کہ ٹولی باندھ کر ایک ساتھ نکل آئیں۔ سنا نہیں کہ سہج پکے سو میٹھا ہو۔ پہلے تو قدرت نے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر رکھا تھا۔ کم از کم تین چار برس کی سوڑ ہوتی تھی۔ ایک کے بعد دوسرے کے لئے برسوں ترسا کرتے تھے اللہ آمین سنائی جا رہی ہے۔ تو یہ گنڈے ہو رہے ہیں۔ پھر اس زمانے کی اولاد کو دیکھو تو نک سے سکھ تک درست نہیں ماں باپ کا پورا نمونہ۔ صورتوں پر نور برستا تھا بات یہ ہے کہ قدرت کے انتظامات میں ہم نے دخل دینا شروع کر دیا۔ قدرت نے بھی رسی ڈھیلی چھوڑ دی۔ جیسے ندیدے بھان ویسا ہی آموز کی علت دسترخوان روک ٹوک نہ دیکھ پل پڑے۔ یہ ہنسی ہونی ہی تھی۔ بچے نکلوانے کا ہیضہ ہو گیا۔ بیکاری کا شغل ہی یہ ہو گیا ہے کہ بچے بنائیں۔ بنائیے صاحب شوق سے بنائیے کون روکتا ہے مگر نحوست تو اپنے سر پر نہ لائیے۔ کیا ہرج ہے اگر ایک کو پال پوس کر دوسرا بناؤ۔

بعض قوموں میں اولاد کی کثرت منحوس سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی اچھے وقتوں میں قاعدے مقرر تھے۔ دولت کے ہاتھ اگر سلیقہ نہیں تو دولت ایک مستقل نحوست ہے۔ اسی طرح اگر کسی میں بچوں کی نگہبانی اور تعلیم و تربیت کا سامان نہیں تو کیوں ایسی تمنا کرے جس سے قوم کا نام بدنام ہو اور آپ الگ پراگندہ احوال رہے ذوق مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

توڑے مگر شاخ کو کثرت نے ثمر کی
دنیا میں گرانباری اولاد غضب ہے

نعمت کو غضب الٰہی کہنا بظاہر اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن نعمت کو نعمت کی طرح سمجھا بھی جائے اولاد آج کل جس شان سے پیدا کی جاتی ہے اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ نے کرم کیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ حیوانیت کی ابلتی ہوئی دیگچی کا سر

پوش الٹ گیا۔

خدا کی جس پر غیر معمولی مہربانی ہے اس کا تو ذکر کیا۔ عام طور پر کوئی امیر ہو یا غریب ہر نوبیاہتے جوڑے بچہ پیدا کر کے خوش نہیں رہ سکتا۔ دیر سویر اسے اپنی غلطی محسوس ضرور ہوتی ہے۔ کیسا ہی دولت مند اور کیسا ہی سلیقہ والا ہو ایک نہ ایک دن پھر وہاں سے گھبرائے بغیر نہیں رہتا۔ ایک کھڑا ہونے لگا ہے۔ دوسرا گھٹنیوں چلتا ہے۔ تیسرا پنگوڑے میں چوتھا گود میں پانچواں پیٹ میں فرمائیے۔ نورتن اچار میں اور اس میں کیا فرق رہا۔ نکالنا چاہتے ہیں کھیرے کا ٹکڑا نکلتی ہے ہری مرچ ایک چیز گلی ہوئی ہے تو دوسری کچی۔ زندگی کی حلاوت کہاں پھر جو پاؤں چلنے لگا ہے اس کی تربیت کیجئے یا گھٹنیوں چلے پنگوڑے میں جھولتے کی دیکھ بھال اور پیٹ والے کا خیال۔ دودھ پلانے۔ پوتڑے دھونے ہی سے چھٹکارا نہیں۔ پہلوٹھی کا بچہ عموماً ماں باپ کی آنکھوں کا تارا ہوتا ہے۔ اگر اس کی نگہداشت میں پوری توجہ کی گئی۔ اسے باقاعدہ اٹھایا گیا اور اس پر پدری و مادری ساری شفقتیں چھوٹی نہیں بلکہ سچی صرف ہو گئیں تو یہ ایک نمونہ ہو گا دوسرے بھائی بہنوں کے لیے اور پھر جتنے بچے ہوں گے اسی کے نقش قدم پر چلیں گے۔

بچوں کی جسمانی روحانی اور اخلاقی تربیت کا پہلا مکتب گھر ہی تو ہے ان کی آنکھیں کھلتے ہی اپنا گردوپیش دیکھتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ دھول کوٹ کے کھیت میں گنے کے چھلے کیوں کر ہو سکتے ہیں بلکہ کابل کا سردہ بھی بھوٹ بن کر رہ جائے گا۔ اس لیے کہ ایک بیل ہو تو اس کی تو دیکھ کر لی جائے۔ فالیز کی فالیز کو تو میٹھا بنانا بہت مشکل ہے علاوہ ازیں بچے ابتدا میں سکھائے نہیں جاتے بلکہ جیسا دوسروں کو کرتے دیکھتے ہیں خود بھی کرنے لگتے ہیں بقول ڈاروِن انسان آخر بندر ہی ہے نا۔ اصلیت

کہاں جائے۔ بڑا ہو کر چاہے آدمی بنے یا حیوان رہے۔ چار پانچ برس تک تو اس کے حرکات بندریت سے کچھ زیادہ بلند نہیں ہوتے۔ نقل کرنا اس کی جبلت میں داخل ہے۔ نقل بڑوں کی ہو یا چھوٹوں کی یا برابر والوں کی۔ پھر یہ قدرتی چیز ہے کہ اپنے سے چھوٹی یا برابر والوں کے ہوتے بڑے بوڑھوں کے ساتھ نہ کوئی کھیلتا ہے نہ ان کی نقل کرکے خوش ہوتا ہے۔ اب اگر گھر میں بہت سے بچے ہیں اور سب کس مپرسی کی حالت میں تو یہ سمجھ لو کہ کتب کا کتب اوندھا ہوگیا۔ اللہ اپنی قدرت سے آدمی بنا دے تو بنا دے ورنہ خیریت ہے۔

اس کا علاج؟ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ایک بچہ کے بعد کم سے کم چار پانچ سال کا وقفہ ہو تاکہ کچا زمانہ نکل جائے۔ اور وہ والدین کی پوری توجہ کا مرکز بن گیا ہے گھر کی روایتیں سیکھ لے اور دوسرے آنے والے بھائی بہنوں کا خیر مقدم کر سکے۔ لیکن یہ کب ہو سکتا ہے؟ جب ہم اپنی زندگی، اپنی طاقت اور اپنے جذبات کا صحیح استعمال کرنا سیکھیں۔ تقدیر اور تدبیر کو سمو کر دنیا میں رہنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ یا تو ننگ رہیں گے یا گیارہ رہیں گے۔ لنگوٹ بند تو آج کل کسی کو کہنا مشکل ہے بڑے بڑے مذہبی اور فوجی سورماؤں کو دیکھ لیا۔ ضعفی کمزوری کا ذکر نہیں۔ خواہ اپنی دست کاری سے ہو خواہ قدرتی۔ مرد ہونے کا اظہار اس کے سوا کر ہی نہیں سکتے۔ کہ ہر وقت تخلیہ کی ضرورت۔ جوانی پھٹی پڑتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ بے قید ہیں تو بھنبریت اور شادی کا پھندا گلے میں پڑے گا۔۔ تو ہر سانس میں بچہ! تو عورتیں بھی کچھ ایسے ہلکے پیٹ کی ہو گئی ہیں کہ مرد کی ہوا سے حمل رہ جاتا ہے۔ ہزاروں بدنصیب اسی اپھارے کے مرض میں ہر سال مرتی ہیں مگر کیا مجال کہ انھیں عبرت ہو اور اپنی جان کے لیے نہ سہی اپنے بچوں کی خاطر ذرا صبر کریں۔

ان باتوں کو کیا جاہل کیا پڑھے لکھے۔ نئی تانتی کے ہوں یا پرانی کے کرد

پیش سب ہی جانتے ہیں مگر عاقبت اندیش نہیں۔ "بر بیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی گت پر برابر ناچ جاری ہے۔ ہاں تو خواجہ شریف چند سال کے عرصہ میں چھ بچوں کے باپ ہو گئے۔ قویٰ مضمحل ہونے چاہیے تھے۔ بیوی نک چڑی پلک منتی۔ کرموں پھوٹی۔ ادہر آمدنی کم اور اس قدر کم کہ تن کو ہے تو پیٹ کو نہیں پیٹ کو ہے تو تن کو نہیں۔ کوئی سہارا دینے والا نہیں۔ دوسرے عمر کا تقاضا۔ ساٹھے اور پاٹھے کا زمانہ ڈھل چکا تھا فارغ البالی ہو تو واقعی آدمی کبھی بوڑھا نہیں ہوتا ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جائیں تو پڑ جائیں دل جوان رہتا ہے یہاں دل و دماغ پر جسم سے زیادہ بار۔ تعجب یہ تھا کہ اتنی کھکھیڑوں میں زندہ کس طرح تھے اور فی الحقیقت تو بس ہوتا وہ بلاوے سے آ جاتی تو شاید نہ چوکتے یا خاندان کی لاج نہ ہوتی تو میرا من طوطے کی طرح پنجرا توڑ پر جھاڑتے ہوئے اڑ جاتے "بعد از سر حق کن فیکون شد شدہ باشد"۔ کہنے والے یہی کہتے تاکہ ؎

بہ بیں آں بے حمیت را کہ ہرگز	نخواہد دید روئے نیک بختی
تن آسانی گزیند خویشتن را	زن و فرزند بگزارد بہ سختی

کہنے کی زبان کون پکڑتا ہے اور کہنے والے اب بھی نجانے کیا کیا کہتے اور تو دور بہنوں بھائیوں، ماں اور بیوی تک ہزاروں قسم کی باتیں بنائی کہیں نکل جاتے تو کانوں میں یہ گندی آوازیں تو نہ پڑتیں۔ اپنی تو مزے میں گزر جاتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ پردیس میں کوئی زیادہ کمائی کی صورت نکل آتی۔ حرکت میں برکت مشہور ہے وہ جو کہتے ہیں کہ دیس چوری پردیس بھیک جن کاموں سے وطن میں انسان شرماتا ہے کہیں جا کر وہ نہیں رہتی۔

لیکن تقدیر کا کھوٹ اور ہونوں کی شامت نے سارے رستے مسدود کر دئے تھے۔ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ باہر نکلیں۔ پاؤں میں ایسی بیڑیاں پڑی

تھیں کہ ان کے بوجھ سے ایک قدم سرکنا محال تھا۔ غرضیکہ شادی غریب کے حق میں بشادی بن گئی۔ مذہب کہتا ہے کہ ماں کا دل نہ دکھاؤ۔ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ اسے ناراض کروگے تو وہ چھن جائے گی۔ شریف نے ماں کا دل ہی توڑ رکھا تھا۔ اس کے قدموں کے نیچے والی جنت ہی کی تو خواہش تھی جو بیٹے جی دوزخ میں جا پڑا۔ اور پھر لطف تو یہ ہے کہ اس جنت والی نے بھی منھ پھیر لیا۔ جب تک بیٹے کو گجتے والا سمجھا یہی کہتی رہی کہ میرا کہا نہ کیا تو دودھ نہیں بخشوں گی اور جس وقت بیٹے کو کانس میں پھنسا دیا تو کیسی آنکھیں بدل گئیں دودھ میں زہر ملانے سے نہ بخشتی تو شریف عاقبت ہی کا گنہگار رہتا۔ دوار جیا تو نہ پڑتیں کہ یہاں بھی پٹے اور وہاں بھی مار کھائے۔

معاش و معاد کے لحاظ سے انسان کے کئی طبقے ہیں۔ شرافت اور رذالت سے بحث نہیں۔ شرافت مفلس کے اندر بھی ہو سکتی ہے اور دولت کے دھنی غیر شریف بھی۔ اسی طرح سلیقہ کچھ امیروں ہی کا حصہ نہیں غریب بعض اوقات ایسے مہذب دیکھے ہیں کہ دولت والوں کو رشک آ جانا چاہیے۔ لیکن وہ گھرانے جن میں کبھی دولت تھی اور آج ان کے ہاں افلاس یکایک آ گیا۔ انھیں حقیقت میں بڑی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ غریب جن کی پشتیں غربت میں بسر ہوئی ہیں۔ جن کی زندگی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی جو ہمیشہ سے یکساں حالت میں ہے۔ بچپن اور جوانی ایک ہی فضا میں گذاری انھیں ماحول کی بے ترتیبی سے کیا خلجان ہوگا۔ مصیبت کا سامنا تو ان کو ہے جن کا دماغ عرش پر اور وہ خود زمین مذلت میں دھنسے جاتے ہیں۔ آنکھوں میں سرسوں پھولی ہوئی اور سامنے کھیت سیتاناسی کا۔ شریف صاحب چلنا چاہیں اپنے بزرگوں کی ڈگر پر اور پاؤں اٹھانے کی سکت نہیں۔ بیوی سے تمام امیدیں منقطع ہو چکی تھیں

بچوں کا برادر جہ تھا۔ صورتوں پر ذالت برسنے لگی تھی۔ گھر کا یہ احوال کہ دیکھ کر گھن آئے۔ تھکا ہوا وقت، ہاری ہوئی قسمت۔ افسوس کے سوا اور کیا کرتا۔ چنانچہ آج اٹھارہ برس سے ہم اسی طرح دیکھ رہے ہیں۔ نہ مرنے کی دعا قبول ہوتی ہے نہ جینے کی۔ خدا جانے غریب کو اس ایک غلطی کا خمیازہ کب تک بھگتنا پڑے گا۔ آثار تو اچھے نہیں۔

بابو مٹکینا

بابو مٹکینا اب تو جتنے مزاج ہو یا سڑی سودائی کہلائیں اور اپنی بدمزاجی سے تکلیفیں اٹھائیں کم ہے۔ اس لیے کہ برسوں سے بیمار۔ بیماری بھی ایک نہیں، تھم گئے دست تو بخار آیا، طرہ یہ کہ مفلس کوڑی کوڑی کو محتاج۔ دوستوں کی فیاضی پر گزارہ۔ نہ موت نہ زندگی کے آثار، ہاتھ پاؤں نہ چلیں زبان چلے جاتی ہے لیکن جب تندرستی تھی۔ پیسہ بھی تھا اس وقت کون سے پتھر پڑتے تھے ہم نے ان کا لڑکپن بھی دیکھا۔ جوانی بھی دیکھی اور اب تیسرا برن بڑھاپا برا پا بھی دیکھ رہے ہیں۔ یاروں میں انھیں سدا چھوئی موئی کا درخت ہی پایا۔ جہاں کوئی دل لگی میں ذرا ناگوار ہوا اور ان کی تیوری پر بل پڑے۔ کسی نے چھیڑا اور یہ تنک کر اتنی دور کہ اچھوت سے جا بچائی بھی۔ آنا شاید ہی ہو کہیں۔ اسکول کا زمانہ کیا آپس میں گھل مل کر بسر ہوتا ہے نہ کھانے پینے میں پرہیز نہ اٹھنے بیٹھنے میں اونچ نیچ کا خیال۔ جس کو دیکھو شرارت کا پتلا۔ ایک دو نالے کچھ کھا رہا ہے دوسرے نے ہاتھ مار دیا۔ تیسرا اچکا کر لے گیا۔ پیاؤ پر کوئی پانی پیتے کھڑا ہوا۔ دھکا پیل شروع ہو گئی۔ لڑکوں کا شیطانی لشکر خدا کی پناہ۔ ہمارے بابو مٹکینا اس وقت بھی چڑ چڑاتے تھے۔ اوک سے پانی پینا ان کے نزدیک بدتمیزی تھی۔ ایک دن گرمی کا موسم

تھا۔ پیاس لگی۔ آخر برت سے تو تھے نہیں۔ سونتہ دیکھ کر پیاؤ پر پہنچے۔ پیاؤ والے بامن کو ہنسی سوجھی یا کیا ہوا اس کے ہاتھ سے لٹیا چھوٹ گئی۔ بابو صاحب چھینٹم چھینٹ۔ بہت بگڑے اور جھٹ ہیڈ ماسٹر صاحب سے جا شکایت کی کہیں ان کے منہ سے نکل گیا کہ اگر تم تو اوک سے پانی پینا نہیں آتا۔ تو منگینا اپنے ہاتھ میں رکھا کرو۔ ان کے دل کو لگ گئی اور یہ اپنی جیب میں ایک دو منگینے ضرور رکھتے اس دن سے یہ بابو منگینا مشہور ہو گئے۔ اور ایسے مشہور ہوئے کہ آج پنڈت کمٹ بہاری لال ان کا اصلی نام تو لوگ بوجھتے بوجھتے تھک جائیں اور اتا پتا ہی نہ لگے۔ بابو منگینا کہہ کر دیکھ لو راہ چلتا بھی بتا دے گا۔ کہ وہی نا جو خدا کے فالتو بندوں میں ہیں۔ منڈ چڑوں کی وضع کے۔ جن کے ہنکارے کی آواز دور سے سنائی دیتی ہے۔ تسمہ پا جس کی گدی پر سوار ہوئے۔ چین بلوا کر چھوڑا۔

آپ فٹ بال بھی کھیلتے تھے۔ دم درود وا جبی تھا آواز البتہ کراری تھی دور ہی دور سے پھدکتے۔ گیند سے دو گز آگے یا چار گز پیچھے۔ جہاں کوئی چش کرنے آیا اور انھوں نے ڈانٹا "قانون سے" چنانچہ کھیل کے میدان میں جو انھیں پکارتا قانون سے کہہ کر پکارتا۔ کبھی گر جاتے تو بغیر اٹھائے نہ اٹھتے اور دونوں کا رونا روتے رہتے۔ اپنے ہجولیوں پر حکومت کرنے سے بہت خوش ہوتے کیا مجال کہ ان کی طرف دیکھ کر کوئی ہنسے یا بات کرے۔ کسی نے کھسر پھسر کی اور ان کا پارہ چڑھا۔ کہیں اشارے بازی ہو یہ اپنی جانب منسوب کر لیتے۔ خفگی ناک پر دھری رہتی۔ آج اس سے ناراض تو کل اس پر لال پیلے ہو رہے ہیں۔ زمانہ اچھا تھا۔ سب شریفوں کے بچے ہوتے تھے۔ گھڑی بھر کو بگڑے پھر ایک۔ ان میں کوئی نسی سرخاب کی دم لگی ہوئی تھی لیکن کسی نے ان کے نکتوڑوں کا جواب نہیں دیا۔

اپنی جھنک میں یہ کسی کو اول فول بھی بک دیتے تو بات مذاق میں ٹل جاتی۔ کیوں؟
اس لیے کہ پنڈت میں نرالی طبیعت اور چڑچڑے مزاج کے سوا دوسرا
کوئی عیب نہ تھا۔ سب کے لیے ان کے دل میں ہمدردی تھی۔ ہندو مسلمان
ہر ایک کی تکلیف میں یکساں شریک ہوتے ۔

اسکول سے نکل کر ضرورت پیش آئی کہ ملازمت کریں۔ اتفاق سے
فوراً ہی ملازمت مل گئی اور ایسی جگہ جسے دنیا کی جنت کہتے ہیں۔ ادھر بلی کے
بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ پچھلے جنم میں خرگوش ہوں گے۔ شکاریوں کی جان بھٹ
سے نکلتے ہی ہٹ ہو گئے۔ اب آدمی کی جون میں آئے۔ پرماتما نے جیتے
جی سرگ میں بھیج دیا۔ چھٹتے ہی دو سو روپے تنخواہ ہوئی۔ ادھر جوانی میں سب پر
روپ ہوتا ہے اور روپ کے ساتھ وہ لے بھی۔ شکلنے میں سمائی نہ تھی۔ اول بڑے
کمزور تو دودھ میں جاگوں کے سوا ہوا کیا ہے۔ چار دن میں نچھ کر رہ گئے۔ دو برس
کے بعد وطن آئے تو جھلنگا بنے ہوئے۔ پہاڑی جیش نے نبینگ گرا دی
آنتوں میں زخم۔ جگر خراب۔ کڑی کی صورت لیکن زندگی تھی۔ زندگی کیا پاس پیسہ تھا
روپے کو گھر خدمت کے لیے عزیز اقارب۔ حکیم ڈاکٹر آموجود ہوئے۔ نوکری تو خیر گئی ہاں
مرنے سے بچ گئے۔

بن آئی کون مرتا ہے دوا درمن نہ بھی ہوتی تو کیا مرتے انھیں تو دوسروں کی
چھاتی پر اپنی کھٹیا رکھ کر کوتھنا تھا۔ کئی مہینے کے لگاتار علاج سے جی اٹھے مگر زندگی
اجیرن ہو گئی۔ دو دن ذرا ٹھیک رہے تو دو مہینے پھر پلنگ پر سوار۔ برسوں موت و
حیات کی درمیانی فضا میں جھولا جھولا کئے۔ کبھی کھڑے ہو جائیں کبھی لیٹ جائیں ہائے
ہائے کی ایسی عادت پڑی کہ تولہ بھر دکھ ہوتا تو دو تولے کیا دو سیر جتاتے جو سنتا اس کی
سنتے اپنا ہی دکھڑا روتے گویا ساری دنیا ان کی بیماری کی ذمہ دار ہے۔ دراصل

بات یہ تھی کہ جوں جوں دن گزرتے تھے پیسے کا توڑا ہوتا جاتا تھا۔ نقدی ختم ہونے کے بعد گھر کے اثاثہ کا ڈنگا لگا۔ ایسے موقع پر بعض اخلاقی کمزوریوں سے کام لینا پڑا۔ پرانے دوستوں میں بعض نے انھیں اسامی بنایا۔ بھائی بندوں نے مخالفت کی یہ سمجھے کہ کنبہ دشمن ہوگیا۔ آخر تیج پڑ کر رہ گئے۔ شکایتوں کے سوا کچھ نہ رہا۔ بیماریوں کا وہی جوار بھاٹا۔ ہمدردی کے ساتھ وہی ہاہا ہی۔ جس نے کوئی سلوک کیا اسی کی جان کو آگئے۔ مگر ان کی اس تکلیف دہ عادت کے باوجود کچھ احباب ایسے ہیں جو ان کی خبر گیری میں کوتاہی نہیں کرتے۔

چالیس برس سے میری بابو مشکینا سے یاد اللہ ہے پچھلے پانچ سات سال میں سر راہے گاہے ملاقات ہو جاتی۔ وہ پیشہ ہیں کا می ان کی کہانی شیطان کی آنت مجھے اتنی فرصت کہاں کہ آدھا دن ضائع کروں اور ایک دفعہ کا ہو تو یہ بھی سہی وہاں پھر ملنے کی بچ تھی۔ جھوٹا سچا وعدہ کرکے ٹال دیتا۔ کیونکہ دوسروں کی پریشانی سے انھیں واسطہ نہیں۔ دنیا کس دور سے گزر رہی ہے۔ وہ سننا نہیں چاہتے۔ ان کے خیال میں سب مزے میں ہیں مصیبت ہے تو صرف ان کے لئے۔ ان کی کہانی سچی اور سب کی جھوٹی۔ کوئی اپنی نہ کہے فقط ان کی سنے۔ سنے ہی نہیں بلکہ ان کی بیماریاں سمیٹ کر اپنے اندر رکھ لے۔ آپ مر جائے اور انھیں زندہ کر دے۔ لہٰذا ہمیشہ ان کو مجھ سے شکایت رہی اور شکایت بھی سخت۔

اب کوئی چار مہینے ہوئے اتفاق کی بات مجھے ایک معاملے میں بابو مشکینا کی ضرورت پڑی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ نیا نو دن اور پرانا سو دن۔ گھر کا کھنڈر بھی پرائے محلوں سے زیادہ آرام دیتا ہے۔ بنی ہوئی ملاقات کام آئے بزرگوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اپنے بس کتے بلی سے بھی بگاڑنی نہیں چاہیے نہ جانے کب ان سے کام پڑ جائے۔ اپنی غرض تھی لالہ اور انھوں نے امید سے زیادہ میرا ساتھ بھی دیا۔ کیا

پڑی کا شور ہو۔ بہرحال مجھے ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ لیکن اس اثنا میں جو میں ان کے پاس کئی مرتبہ گیا تو جان عذاب میں آگئی اور اب غصہ بھی آتا ہے اور ترس بھی غصہ ان کی بساندی باتوں پر اور ترس ان کے حال پر۔ بیچارے ایسے تنکے کی طرح ایک کونے میں پڑے ہوئے ہیں جس میں ہزاروں بال جھول اور لوٹنے کا نام نہ لے۔ کسی مصرف کے نہیں۔ نہ زندوں میں داخل نہ مردوں میں شمار۔ جگو ان کی ابا ہے نہیں لیتا۔ ہم سمجھیں کہ ان کا جینا بیکار ہے۔ اس کے بھید وہی جانے۔ ایک مداری کے کھیل تو سمجھ میں آتے نہیں خدا کی باتیں کیا سمجھ میں آئیں گی۔

پہلے روز جو میں پہنچا اور کنڈی کھٹکھٹائی تو بڑی کراری آواز میں پوچھا "کون؟" میں دانستہ خاموش رہا۔ جھلا کر بولے "بس اب گونگے ہوگئے۔ زبان بند ہوگئی ارے میاں کون ہو؟ اندر آجاؤ۔ میں مردہ ہوں باہر نہیں آسکتا؟"

میں :۔ پردہ ہے آجاؤں؟

بابو :۔ کہہ تو رہا ہوں اور کیوں کر کہوں۔ نقارے بجاؤں ہرکارے دوڑاؤں۔

میں :۔ (ذرا شرارت سے) زنانہ تو نہیں؟

بابو :۔ (سخت لہجہ میں) "ابہرے ہو" میں دیوانہ ہوں کہ زنانے میں بلاؤں گا۔

میں اندر داخل ہوا تو وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ ابے چودھری آخر یہ کیا حرکت تھی۔ مرتے کو ماریں شاہ مدار۔ مجھ میں چیخنے کا دم کہاں۔ تیرا ابے کا بن نہیں گیا۔

میں :۔ بھئی بیمار تو واقعی معلوم ہوتے ہو مگر آواز ابھی تک کراری ہے۔

بابو :۔ تمہاری خوشی ہے کہ آواز بھی نہ نکلے۔ گلا گھونٹ دے۔ ارے سنگ دل مر رہا ہوں۔ سانس سینے میں نہیں سماتا۔ اچھا آج کیا جاتی دنیا دیکھی جو ادھر آ نکلا۔

میں :۔ پوچھنے آیا ہوں کہ مرگھٹ جانے کا کب تک ارادہ ہے؟

بابو:۔ لعنت ہے تجھ پر! ابے تو اپنی کہہ۔ کس چکی کا پسا ہوا کھاتا ہے۔ جب دیکھو نڈ منڈ۔

میں:۔ اور تم چلو۔

بابو:۔ ہاں بھائی سچ ہے۔ جس کی نہ پھٹی ہو بوائی وہ کیا جانے پیڑ پرائی۔

میں:۔ اچھا دل لگی تو ہو چکی۔ اب یہ بتاؤ کہ حال کیا ہے؟

حال کیا پوچھا شہد کی مکھیوں کو چھیڑ دیا۔ اب جو بھنبھناہٹ شروع ہوئی تو ختم ہونے پر نہیں آتی۔ کوئی رنڈیا بھی اپنا دکھڑا کیا روئے گی جیسا کہ روتے ہیں کنبے کی برائی۔ ملنے والوں کا شکوہ۔ مفلسی کی داستان۔ بیماری کا رتی سے رائی تک حال کہ نبض کی رفتار یہ ہے۔ ریاح میں ایسی آتی ہیں۔ صبح سے سنتے سنتے دوپہر آگئی تو میں نے کہا "سنو بھئی میں اور کچھ تو جانتا نہیں۔ اگر ضرورت ہو تو کہہ ڈالو۔

بابو:۔ ابے میں بیمار ہوں فقیر نہیں۔

میں:۔ کون کہتا ہے کہ تم فقیر ہو لیکن میرا مطلب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بابو:۔ (بات کاٹ کر) دوا ختم ہو چکی ہے۔

میں:۔ دوا لا دوں؟

بابو:۔ ڈاکٹر سے حال کہہ کر دوا لا دو تو بڑا کام کرو۔

میں:۔ کہو۔

بابو:۔ (فلسکیپ کا ایک پورا شیٹ دے کر) حال یہ ہے۔

میں:۔ اور اسے پڑھے گا کون؟

بابو:۔ تم سنا دینا۔ بارہ بجے ڈاکٹر اٹھ جائے گا۔

میں ڈاکٹر کے پاس گیا۔ حال سنایا، دوا لی اور واپس آکر شیشی حوالہ کر فوراً چلتا۔ اپنی غرض تھی دوسرے دن پھر پہنچا۔

بابو:- کیوں جی میں ہوا تھا- پڑ لیتا- بغیر کچھ کہے سے چل دے- دوا یوں ہی رکھی ہے

میں:- پی نہیں؟

بابو:- کیوں کر پیتا- کب پیتا- تم نے تو وہاں ٹال دیا-

میں:- رات کو کیا کیفیت رہی؟

بابو:- ہائے کیا بتاؤں؟ بھائی صاحب کو پروا نہیں- ان کی جورو میری جانی دشمن ہے- کھچڑی کو کہا تھا- شام سے پکا کر رکھ دی رات کو دس بجے کھانے بیٹھا تو ٹھنڈی بالا- پھر دال الگ کچی- نمک زہر- فلقے سے پڑ رہا- صبح سے چائے بنا کر بھیج دی-

میں:- رات کو دس بجے کھانے کا وقت ہے؟

بابو:- بھوک لگے گی جب ہی کھاؤں گا-

میں:- اچھا چائے کیوں نہ پی؟

بابو:- جی نہیں چاہا-

میں:- تو پھر اس میں دوسروں کا کیا قصور؟

بابو:- ہاں خطا وار تو میں ہوں- ان بدمعاشوں کو کوئی کہنے والا نہیں جو مجھے کچوک کچوک کر مارے ڈالتے ہیں-

میں:- غنیمت سمجھو- بھائی کے پاس ہو-

بابو:- بھائی ہے! قصائی کہو- اس کا بس نہیں چلتا کہ میرا گلا گھونٹ دے- صبح کا نکلا چار بجے آتا ہے- آیا اور پھر نکل گیا- میں بات کرنے کو ترستا ہوں جورو اس کی مجھے کتے سے بدتر سمجھتی ہے-

میں:- ارے میاں جس طرح گزارہ ہو کرو- اب تمہارے لئے نوکر کہاں سے آئیں جو ہو سکتا ہے کرتے ہیں- تم بھی تو اپنی بانی سے باز نہیں آتے-

بابو:- میں مردہ- میری آواز تک تو نکلتی نہیں- میرا کسی سے کیا بوجھ؟ دوا درمن کی کسی

کو تکلیف نہیں دیتا۔ لیکن یہ کھٹمل تو مجھے کھا جاتے ہیں۔ لو ادھر دیکھو (ایک کاغذ نکال کر) میں تو لکھتا جاتا ہوں۔ پاخانے میں بیٹھا گنو رہا تھا۔ وہ مالزادی کبھی پر مبرز کے رستے دم نکل رہا ہے۔ پھر ایک دن میں آواز دیتا وہ جواب میں کہتی رجوا! مرگ۔ پرسوں بجائے کیا بات ہوئی شیرنی کی طرح غرا کر بولی۔ تم نے جو برس میں ایک روز بھی سچ نہ بولا۔

میں:۔ اچھا ان باتوں سے نتیجہ؟ مفت میں اپنا جی جلاتے ہو۔

بابو:۔ تم بھی مجھ ہی کو دباتے آئے۔ اس نالائق کو بھی تو کہو کہ اپنی جڑ واچاری کو جوتیاں مارے۔ آخر میں اس کا بڑا ہوں یا نہیں۔

میں:۔ تو آپ کی مرضی ہے کہ وہ اپنا گھر بگاڑ لے۔

بابو:۔ اچھا میری خدمت سے جان تو نہ چرائے۔

میں:۔ اپنے چار پیسے کے روزگار کو دھتا بتا کر رات دن تمہاری آنا کانا لیا کرے بھائی وہ بات کرو جو دھری اٹھائی جائے۔ مرنے کے ساتھ کوئی نہیں مرا کرتا۔

ایسی معقول بات سننے کی بابو منگینا میں کہاں تاب تھی۔ سانپ کی طرح پھنکارے مارتے مجھ کو تکتے جاتے۔ بڑی مشکل سے سامان میں آئے۔ تھوڑی دیر میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ اس کے بعد رخصت چاہی تو تھرمامیٹر کی فرمائش ہوئی اور مجھے وعدہ کئے بنی۔ عالمگیر جنگ کا زمانہ۔ اچھی چیز کمیاب اور مہنگی دکانداروں کو ایسا موقع خدا دے۔ برے سے برا مال گاہک کے سر مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کئی دکانوں پر دیکھ بھال کر تھرمامیٹر لیا اور اسی روز شام کو نذر گزرانی۔ خوش تھا کہ دوست کی ایک ضرورت پوری کی۔ مگر بابو منگینا ایسے کہاں انھیں ہر کام میں کیڑے ڈالے بغیر چین نہیں آتا۔ تھرمامیٹر کو دیکھتے ہی نقص نکالنے شروع کر دیے "کہاں سے اٹھا لائے یہ کس مصرف کا ہے۔ اب اس کے واسطے خود

بین لاؤں۔ آدمی ہو یا جانور میاں اتنی خبر نہیں کہ کس کے سوا سب بے اعتبار ہوتے ہیں۔

میں:۔ کس کا نہ لے تو کیا کروں؟

بابو:۔ کتا کیوں نہیں۔ تلاش ہی کیا ہو کسی کی بکری اور کون ڈالے گھاس۔

میں:۔ تمہاری یہی عادت تو خراب ہے۔ نیکی بر باد گناہ لازم۔

بابو:۔ ہاں جی میری عادت خراب ہے۔ ہائے جو ہے مجھ ہی کو کہتا ہے۔ خیر تم لوگوں سے خدا سمجھے گا۔

میں:۔ واہ واہ واہ۔ کوستے ہو۔ تمہاری اسی گندی فطرت نے تمہیں اس درجہ کو پہنچایا ہے۔ اپنوں کی اپنایت کھو دی۔ دوستوں نے ہمدردی سے ہاتھ اٹھایا چھوڑو۔ ان باتوں کو ورنہ مٹی پلید ہو جائے گی۔

بجائے اس کے کہ وہ میرے شکر گزار ہوتے لگے پھنکارے مارنے میں بھی آدمی ہوں جل گیا ارادہ کر لیا کہ ان سے دور ہی کی صاحب سلامت اچھی۔ ان کی خدمت کے یہ معنی ہیں کہ اپنی اچھی بھلی جان کو روگ لگایا جائے۔ اپنے وقت کا اپنے پیسے کا نقصان کرو اور بدلے میں لاکھوں باتیں سنو۔ نیکی کے عوض برائی پلّے بندھے۔ جب سنو دوسروں کی شکایت۔ کوئی پوچھتا نہیں۔ میں نے یہ کیا اور لوگ میرے ساتھ یہ کر رہے ہیں۔ فلاں تماشے میں جاتا ہے۔ میرے پاس نہیں آتا۔ فلاں مجھے دیکھ کر کنی کاٹ گیا۔ فلاں نے میرے رقعہ کا جواب نہیں دیا۔ فلاں بڑا بدمعاش ہے۔ فلاں ایسا ہے اور فلاں ویسا۔ گویا وہ بادشاہ ہیں اور سب ان کے کوڑیا غلام۔" انجان دیکھنے والا ضرور ان پر ترس کھاتے ہیں اور دوستوں عزیزوں کی بے اعتنائیوں پر نام رکھتے ہوں گے۔ کیونکہ ان کے سامنے تو صرف بابو مسکینا کی مسمی صورت اور ظاہری بیماری ہے۔ ان کی زہریلی

فطرت کا حال کوئی کیا جانے۔ آخر کوئی عیب تو ایسا ہے جو تیس برس سے ان کا مزار کسی ایک جگہ نہیں بن سکا۔ کنبہ ہے اور کنبے میں اکثر کھاتے پیتے۔ سگی بہن۔ سگا بھائی۔ نئے پرانے دوست۔ حق نہ سہی، خدا کا خوف کر کے ہی انھیں اپنے ہاں رکھ لیتے۔ ایک آدمی کا گزارہ ہی کیا۔ دو گز جگہ ان کے لئے بہت تھی۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ روپے مہینے کا خرچ۔ اب بھی تو کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ ان کی کفالت کرتا ہی ہے۔ لیکن کوئی روادار نہیں۔ اول اول رشتے داروں نے رکھا بھی۔ خدمت بھی کی۔ جب دیکھا کہ یہ کوڑا پھیلتا ہی جاتا ہے تو ثواب کی خاطر عذاب تو لینے سے رہے۔ چال بتادی۔

مانا کہ بابو مشکین شرافت کے لحاظ سے گول کنڈے کا ہیرا ہیں۔ سدا کے مفلس بھی نہیں۔ بعض دوستوں اور خون شریک بھائیوں نے انھیں ایک وقت میں اسامی بھی بنا دیا۔ بیماری نے واقعی نڈھا کر دیا ہے۔ بیماری بھی ایک دن کی نہیں۔ روگ بھی طرح طرح کے اور بے شک سخت سے سخت۔ آنتوں میں زخم۔ بواسیر۔ فتق کا دو دفعہ آپریشن ہوا۔ جلندر میں کون بچا ہے؟ مگر یہ زندہ ہیں۔ مزاج چڑچڑا ہے۔ پھر جب پیسے کی طرف سے محتاجی بھی ہو۔ دوسروں کے رحم و کرم کا آسرا ہو۔ جس قدر پریشانیوں کا اظہار کریں کم ہے۔ لیکن اوروں پہ نکتوڑے توڑیں۔ خدا سے لڑیں۔ اپنے نصب العین کو دیکھیں یا اپنے اعمال نامے کو۔ وہ یہ غنیمت نہیں سمجھتے کہ اس آپا دھاپی کے زمانے میں ان کا کوئی نہ کوئی سمیٹنے والا تو نکل آتا ہے۔ دعا دیں ہندوستان کی جہالت کو جو آج تک جی رہے ہیں کسی تعلیم یافتہ ملک میں ہوتے تو کبھی کے چندہ دے کر خدا گنج روانہ ہو جاتے۔ سچ ہے کہ بیماری اور مصیبت کسی کے بس کی نہیں لیکن جیسی پڑے اٹھائے دوسروں پہ اسی قدر اپنا بوجھ ڈالو وہ خوشی سے اٹھائیں۔ یہ کیا کہ بھوت بن کر لپٹ

جاؤ۔ جو ہمدردی سے تمہارے پاس آئے اس پر حکومت کرو۔ خدمت کا صلہ تم دے نہیں سکتے۔ تمہاری زندگی کا درخت خشک ہو چکا ہے۔ پھل پھول دینے سے رہا۔ پھر آخر کس امید پر کوئی تمہارے نخرے اٹھائے رہی خدا ترسی تو اسے تم اپنے برے برتاؤ سے کم کرتے چلے جاتے ہو۔ نتیجہ دیکھ لو دوست آنکھیں چرانے لگے۔ میری تو خدا سے دعا ہے کہ ان کا پردہ ڈھک دے یہ بھی عذاب سے نجات پائیں اور دوسرے بھی چھٹکارا پائیں۔

سید وصی اشرف چشتی مالک کتب خانہ علم و ادب دہلی نے
علمی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

دستہ محمد ضیاءالرحمٰن ضیا، رقم